چاند کے دوسری طرف
ہاجرہ مسرور

چاند کے دوسری طرف

افسانے

ہاجرہ مسرور

اسٹینڈرڈ

خانساماں صاحب نے باہر سے آ کر خبر دی "جناب ادھر پانی ٹھنڈا کرنے کی اتنی بڑی مشین بھی ہے۔ مزے سے کھانا پکایا اس میں رکھ دیا۔ اب چاہو آٹھ دن بعد کھاؤ کوئی چیز نہیں سڑے بسے گی۔ جناب عجب چیز ہے۔"

"ہاں معلوم ہے۔ تمہیں کیا فکر پڑ گئی اس کی۔" بیگم ریاض نے کتاب پر سے آنکھیں اٹھائے بغیر ویسی آواز میں کہا۔

"بڑا آرام رہتا ہے حضور۔ ان کے خانساماں نے اکٹھا تین دن کی سبزی ابھی خریدی ہے میری آنکھوں کے سامنے۔ اور جناب اتنا بہت سارا ہی۔ اور دو مرغیاں۔" خانساماں صاحب بدستور انہیں مرعوب کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

"اچھا اچھا اب کچھ پکاؤ گے بھی یا یہیں کھڑے رہو گے۔" بیگم ریاض ذرا جھلا کر بولیں اور خانساماں اس موٹی کھال کی مالکن پر دل ہی دل میں افسوس کرتے کمرے سے نکل گئے۔ بیگم ریاض نے پھر کتاب میں جی لگانے کی کوشش کی لیکن ویرو جمعدارنی جھاڑو اٹھائے کمرے میں داخل ہوئیں تو پوری بتیسی کھلی ہوئی تھی۔

"بیگم صاحب ادھر ایسی چوسو پے (صوفے) والی کرسیاں ہیں اور شیشے والی چھ میزیں۔ اور بیگم صاحب ادھر پورے کمرے کا قالین (قالین) بھی ہے۔" ویرو جمعدارنی ابھی پڑوس سے آئی تھیں۔

بیگم ریاض نے اپنے ذرا سے قالین کے ٹکڑے پر ایک نظر ڈالی اور تیوری چڑھا کر بولیں۔ "اری تو باتیں بنا رہی ہے۔ اور ابھی تک کام کا ہوش نہیں۔ اور دیکھ آج تو میں نے نیا پڑوس سمجھ کر تجھے ان کے ہاں بھیج دیا۔ آئندہ ادھر کام نہیں کرے گی۔

کہہ دینا اپنا انتظام کر لیں۔ میں نے اپنے آرام کے لیے تجھے نوکر رکھا ہے۔ اور گھر کرے گی تو ہمارا کام پڑا رہے گا۔"

ویرو جمعدارنی نے دیوان کے نیچے سے برش نکالا اور پرانے قالین کے بے دردی سے رگڑنے لگی۔ بیگم ریاض برآمدے میں پڑی ڈھیلے بید کی کرسی پر پڑ کر دوبارہ کتاب پڑھنے لگیں۔ لیکن قرار تو عنقا تھا۔ مائی جانو منے کو اٹھائے آئیں تو وہیں پھسکڑا مار کر بیٹھ گئیں اور زور زور سے جھنجھنا بجانے لگیں۔ بیگم منہ تخت کے کتاب پر نظر گڑو دے رہیں۔ وہ مائی جانو کے باتونی پن سے سخت عاجز تھیں۔ اسی وقت مائی جانو نے منے کو گود سے اتارنے کی کوشش کی اور وہ اترنے پر راضی نہ ہوا۔

"لے مار کے ٹھکانے دیتے ہو منے بابو۔" مائی جانو بولیں۔ پھر بھی بیگم ریاض نے نظر نہ اٹھائی تو مائی جانو بڑبڑانے لگیں۔

"پڑوس کی آیا پچاس روپیہ لیوے ہے اور شام کو چھ بجے چھٹی کر کے اپنے گھر چلی جاوے ہے۔ ایک ہم ہیں کہ تیس روپیہ پر پڑے ہوئے ہیں پانچ سال سے۔"

بیگم ریاض کا پارہ ایک دم چڑھ گیا مگر انہوں نے مائی جانو پر صرف آنکھیں نکالیں۔ زبان سے ایک لفظ نہ بولیں۔ کم بخت آیا کہیں ملتی نہیں اور تنخواہ میں کوڑی بچتی نہیں جو بیگی آیا رکھیں۔ مائی جانو کے غصے کے سامنے کچھ بن نہ پڑا تو منہ تھتھا کر اپنے بیڈ روم میں چلی گئیں جہاں فرش پر بچھا ہوا اونی کمبل انہیں بہت پرانا اور بدرنگ نظر آیا اور اس میں بھی قصور نوکروں کا دکھائی دیا۔ خانساماں جوتے پہن کر اس کمرے میں حساب دینے آتا۔ آیا باہر کے مٹی بھرے پاؤں صاف کیے بغیر اندر لاتی اور جمعدارنی ہرگز ٹھیک سے برش نہ کرتی۔ بیگم ریاض کا دم مارے غصے کے گھٹنے لگا۔

کم بخت لالچی بڑھیا! نام تیس روپے کا لیتی ہے اور جتنا میں دیتی ہوں' حساب کرو تو ساٹھ روپیہ مہینہ پڑتا ہے۔ ایک خود ایک اس کا بڈھا اور ایک پوتا تینوں کا کھانا پینا۔ اس پر کوارٹر مفت' کہنے کو پوتا بچہ ہے پیٹ میں یہ لمبے لمبے کینچوے روکی خوراک تو وہی نتھا کھا جاتا ہے۔ کینچوے گرانے کی دوائیں الگ منگواؤ۔ عید بقرعید جوڑا الگ دو۔ پھر بھی پڑوس کی آیا کی تنخواہ پر آنکھیں پھٹتی ہیں بڑھیا کی۔

بیگم ریاض منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی رہیں اور پھر جانے کب اونگھ گئیں۔ جاگیں تو دوپہر ہو چکی تھی۔ سورج کا رخ مڑ جانے سے بیڈ روم میں روشنی کم ہو چکی تھی اس لیے انہیں زمین پر بچھے ہوئے کمبل کا رنگ خاصا اچھا لگا۔ ہلکی سبز دیواروں اور ہرے پردوں نے ان کے ذہن پر پھر ہمیشہ جیسی پر امن مطمئن زندگی کی جھلک ڈالی۔ زندگی جوان کی تھی۔ گھر جو انہیں کبھی برا نہیں معلوم ہوا تھا۔ جہاں بیٹھ کر وہ کتابوں میں مگن ہو جاتیں اور دنیا کے حسین مستقبل کے خواب دیکھا کرتیں۔ اس وقت بھی اسی موڈ میں اٹھ کر کھانے کی میز پر گئیں میز پوش اتنا صاف نہ تھا لیکن انہیں ضرورت سے زیادہ صاف میز پوش دیکھ کر ہوٹل یاد آتا تھا۔ اور ہوٹل گھر نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ مزے سے کرسی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئیں اور پلیٹ میں سے تلی ہوئی مرچ اٹھا کر دانتوں سے کترنے لگیں۔ اور انہیں وہ دن یاد آئے جب ان کے ابا جان چل بسے اور ساری شان و شوکت اڑا اڑا دھم ہو گئی۔ چند ہی برسوں میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ محض نمک لگا کر تلی ہوئی ہری مرچ کے ساتھ روٹی کھانا بھی نعمت معلوم ہونے لگا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بیگم ریاض اب سب کچھ پا کر بھی دنیا کی نعم نام کی طرف سے قطعی لاپرواہ ہو گئی تھیں۔

مگر خانساماں صاحب کو بیگم ریاض کی یہ لاپروائی کھل رہی تھی۔

"جناب جیون (جیمز) سے اب تک کئی موٹر والے ملاقاتی آ چکے ہیں۔ یہ لمبی لمبی موٹر۔ ایک سے ایک بڑھیا۔" خانساماں نے

تازہ ترین خبر سنائی۔

بیگم ریاض کو لگا جیسے خانساماں صاف کہہ رہا ہو کہ کیا خاک افسر ہیں آپ کے صاحب' مہینوں میں کوئی موٹر والا ملاقاتی کوٹھی میں نہیں آیا۔

''ہوں!'' بیگم ریاض اپنی ''ہوں'' کے بعد یہ سوچنے پر مجبور ہو گئیں کہ واقعی ان کے میاں کی دوستی ''بے موٹرے'' لوگوں سے زیادہ ہے۔ اب وہ خانساماں کو کیا سمجھاتیں کہ میاں کے ملنے والے کتنے بڑے کتنے اچھے اور کتنے مشہور لوگ تھے۔

پھر بھی جانے کیوں پڑوس کے ذکر پر کھانا ان کے لیے زہر ہو گیا۔ ویسے سب چیزیں تھیں بھی بدمزہ۔ آلو کے کباب جلے ہوئے تھے۔ مٹر بہت کم گھی میں تلے گئے تھے اور دال میں پانی زیادہ تھا۔ دو چار نوالے مار کر بیگم ریاض نے پھلوں کی طشتری اٹھائی ایک آدھ ناشپاتی کا ٹکڑا کھایا تھا کہ خانساماں صاحب بولے۔

''حضور کی صحت ٹھیک نہیں۔ جناب پھلوں کو مشین میں رکھ کر ٹھنڈا کر لو اور پھر کھاؤ۔ تو پھل بڑا طاقت ور ہو جاتا ہے۔''

اور بیگم کا چڑھتا ہوا غصہ ''طاقت ور پھل'' کے تصور پر مرکوز ہو گیا۔ طاقتور پھل جو ہو بہو ماہ الحم کے اشتہار والی تصویر تھا۔ ''یہ موٹے موٹے لوگ اور پچھے والی ناشپاتی'' اور بیگم ریاض اس تصویر پر ایک دم بے قابو ہو کر ہنس پڑیں۔ اگر وہ اس وقت ہنس نہ پڑتیں تو ڈر تھا کہ رو پڑتیں۔ اب یہ کیا مصیبت تھی کہ اچانک ان کا مقابلہ نئے پڑوس سے ہونے لگا۔ مقابلہ بھی شان و شوکت کا؟ اور یہ دنگل منعقد کرا رہے تھے ان کے نوکر۔

''سچ ہے۔ ذہنیت اس طرح نہیں بدلتی۔ جب تک سارا ماحول ہی نہ بدل جائے۔'' بیگم ریاض نے سوچا۔ وہ اپنے نوکروں کو برابری سے بات کرنے کا موقع دیتے ہیں اسی لیے تو وہ نئے پڑوس کے مقابلے میں انہیں کمتر سمجھ رہے ہیں۔

پھر ایک چور لہر ان کے دماغ سے گزری۔ شاید وہ وہ ہیں ہی کمتر۔ جب شادی ہوئی ان کے میاں کی آمدنی آدھی تھی اس وقت وہ کوئی کپڑا خریدنے لگتیں تو دس بار سوچتیں کہ اس ماہ کون کون سے خرچ گھٹانا پڑیں گے۔ بارہ سال بعد ان کے میاں کی آمدنی کہیں سے کہیں پہنچ گئی مگر اب بھی ایک فالتو خرچ کے لیے دوسرے کئی خرچ کم کرنا پڑتے۔ یہ بات بھی نہ تھی کہ کچھ جمع کرنے کا شوق ہو۔ بچتا تو جمع کرتیں بلکہ کئی برسوں سے خود بھی کالج میں فلاسفی پڑھاتیں اور وہاں سے جو ملتا وہ بھی خرچ ہو جاتا۔ ان کے نزدیک روپے سے اچھا تو گھر کا کوڑا تھا جو روز اکٹھا کیا جاتا تو 22 کے 22 کوڑے کے دام سے اٹھ پڑتا مگر روپیہ بارہ سال پہلے کے بنے ہوئے پرانے معیار کو قائم رکھنے ہی میں بھسم ہو جاتا۔

پرانی پڑوسن کبھی ان کے گھر آتیں تو پوچھے بغیر نہ رہ سکتیں کہ "کیسے آپ نے ریفریجریٹر لیا یا نہیں؟" اور بیگم ریاض ہمیشہ سعادت مندی سے یہی جواب دیتیں کہ "ابھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔"

"لے لیجئے بڑا آرام ہو جاتا ہے۔ اور یہ نہیں تو موٹر ضرور خرید لیجئے روزانہ ٹیکسی میں آپ لوگوں کے کتنے روپے اٹھ جاتے ہوں گے۔" پرانی پڑوسن ہمیشہ محبت سے یہ مشورہ دیتیں گویا دو ہزار نہیں خرچ کرنا چاہتیں تو بہتر ہے کہ پندرہ ہزار خرچ کر ڈالو۔

اب بیگم ریاض بیچاری مروت کی ماری بھلا یہ کیسے کہہ سکتی تھیں کہ ہاں اگر پانچ دس روپیہ روز کی قسط پر کوئی موٹر مل سکے تو ضرور دلوا دیجئے۔ مگر وہ زبان سے صرف یہی جواب دیتیں۔

"ارے زندگی صرف موٹر کا نام تو نہیں۔ ہمارے ملک کے کروڑوں لوگ بس کا کرایہ بھی نہیں خرچ کر سکتے۔ اور پھر انسان خود کو مشینوں کا اتنا محتاج کیوں بنائے۔"

اور بے چاری پرانی پڑوسن بڑی ہمدردی سے سر ہلا کر ٹھنڈی سانس لیتیں۔ ویسے پرانی پڑوسن نے سب میں ڈٹ کر مشہور کر رکھا تھا کہ کم بخت بیگم ریاض بڑی کنجوس ہیں۔ زیور ان کے پاس نہیں دیکھا۔ گھر میں وہی بارہ سال پرانا فرنیچر۔ موٹر وہ نہ لیں۔ زمین انہوں نے خریدی نہیں بینک بھرتی ہیں۔

اور بیگم ریاض نے اس بھرم کو بھی نہ ٹوٹنے دیا۔ ہر ملنے جلنے والے کو معلوم تھا کہ ان کا بینک بیلنس میاں کی چند تنخواہوں سے زیادہ نہیں بڑھتا۔

لیکن اس سب کے باوجود بیگم ریاض کے گھر میں امن و امان تھا۔ ان کا خانساماں پرانی پڑوسن کے خانساماں سے پانچ روپیہ زیادہ تنخواہ پاتا اور کام کم کرتا۔ آیا پڑوس کی آیا سے خود کو خوش نصیب سمجھتی۔ جمعدارنی تنخواہ کے ساتھ مفت کوارٹر پا کر پھولے نہ سماتی کیونکہ پرانی پڑوسن کوارٹر کا کرایہ جمعدارنی کی تنخواہ سے کاٹ لیتی تھیں۔ اور مالی بیگم ریاض کی خوش ذوقی اور نرم مزاجی سے خوش ہو کر تیس روپیہ ماہوار پر بھی گھنٹہ آدھ گھنٹہ جی لگا کر ان کے باغ کی دیکھ بھال کرتا۔

لیکن نئی پڑوسن نے پڑوس میں قدم رکھتے ہی ان کے گھریلو امن و امان کو تلپٹ کر دیا۔ یہ بالکل عملی شکل تھی کہ جب گھر کے نوکر پڑوس کی خوش حالی سے اتنے متاثر ہو جائیں تو کام کیسے چلے؟ بیگم ریاض اپنے خانساماں کے سامنے ریفریجریٹر سے نکلی ہوئی مادر اعظم کے اشتہار جیسی پہلوان ناشپاتی پر چلتے چلتے خود کو بڑا بے بس محسوس کر رہی تھیں۔

آخر انہوں نے سنجیدہ ہونا مناسب سمجھا۔ "دیکھو میاں۔ دنیا میں موٹر اور ریفریجریٹر ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔" بیگم ریاض نے

خانساماں کو سمجھانا چاہا۔

''جی جناب'' پھر اور کیا کیا ہوتا ہے۔'' خانساماں نے بڑے ادب سے پوچھا اور اپنے کندھے سے جھاڑن اتار لیا لیکن خدا جانے کیوں اس سادہ سے سوال پر بیگم ریاض کا فلسفیانہ موڈ ایک دم بدل گیا۔

''تمہارا سر۔ وہ غصہ دباتے بھی بول پڑیں۔

''جی جناب؟'' خانساماں نے کچھ سننا چاہا۔

''میں کہہ رہی تھی کہ تمہارے پاس بنگلہ نہیں۔ نوکر نہیں۔ پھر بھی تم اپنی ذات سے کتنے اچھے کتنے شریف آدمی ہو۔ دنیا میں اصل چیز انسان کی ذات ہے۔ باقی........

''ہاں جناب کیوں نہیں' کیوں نہیں' میری ذات شیخ قریشی ہے۔ اچھی کیوں نہیں ہوگی۔'' خانساماں صاحب جلدی سے بیگم ریاض کی بات کاٹ کر بول پڑے اور شکر ہے کہ بیگم ریاض پھر ہنس پڑیں اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ فی الحال گفت و شنید بند کی جائے۔ وہ میز سے اٹھنے لگیں تو مائی جانو منے کو لیے کھانے کے کمرے میں داخل ہوئیں منے کے ہاتھ میں مرغ کی ٹانگ تھی جسے وہ مزے سے چوس رہا تھا۔

''ارے۔'' بیگم ریاض منے کے ہاتھ میں مرغی کی ٹانگ دیکھ کر چونک پڑیں۔ ''آج گوشت کا دن نہیں تھا نا۔ پڑوس والی بیگم پورا مرغا میز پر رکھے اپنے بچوں کو کھانا کھلا رہی تھیں۔ منے کو دیکھا تو یہ ٹانگ پکڑا دی۔ بڑی محبت کی طبیعت ہے۔

''مائی جانو بڑے لاڈ سے بولیں جیسے گوشت کے ناغے پر مرغ مسلم ان کے بڑی عام بات ہو لیکن بیگم ریاض کے سر کے اندر غصے کا دھماکا سا ہوا۔

''تم وہاں کیوں لے گئیں تھیں منے کو۔'' بیگم ریاض کو اپنی آواز بے حد کرخت لگی۔

''ارے واہ بیوی۔ میں تو منے کو لیے باہر پلاٹ میں بیٹھی تھی۔ بچوں کو لے کر کہیں سے آئی تھیں۔ کہنے لگیں بے بی کو اندر لے آؤ بچوں کے ساتھ کھیلے گا۔ میں چلی گئی۔'' مائی جانو پڑوسن کی طرف سے برا مان کر بولیں۔

اور بیگم ریاض نے جھپٹ کر منے کے ہاتھ سے مرغی کی ٹانگ کھسوٹ کر دور پھینک دی ''واہ ہمارا ان کے بچوں کا جی بہلائے گا۔ اس سے پہلے کسی کے بچے ہمارے بچوں کا جی بہلانے نہ لے آئیں؟ اور تم منے کو دوسروں کے گھروں سے کھانے کی عادت ڈال رہی ہو۔''

یہ کہہ کر بیگم ریاض پھر اپنے بیڈ روم میں محصور ہو گئیں۔ کب منے نے دلیا کھایا کب ان کے دونوں بچے اسکول سے واپس آئے انہوں نے خبر نہ لی۔ دن بھر کتابوں کی الماریوں کو الٹتی پلٹتی رہی۔ ہر کتاب اٹھا کر دیکھتیں اور پھر اسے دوسری کتابوں میں غرق کر دیتیں۔ پھر جانے کہاں سے ایک ابتدائی سی اقتصادیات کی کتاب ان کے ساتھ لگ گئی جسے شام تک وہ بے حد غور سے پڑھتی رہیں اور چائے سے پہلے پہلے بیٹھ گئیں پرانے اخراجات کو کاپیاں دیکھنے۔ پرانی پڑوسن کی باتیں یاد آئیں پھر یہ سوچ کر تسلی کر لی کہ ارے ان کے میاں کے بارے میں سبھی جانتے تھے کہ تنخواہ ایک ہزار تھی لیکن خرچے ہزاروں کے تھے۔ ظاہر ہے کہ اوپر کی آمدنی تھی ان کی۔ پھر زمینوں کی آمدنی الگ۔ ذرا کنجوس لوگ بھی تھے۔ ہم تو آئے دن ان کے ہاں کھانے کی چیزیں بھجواتے' ان کے گھر سے کسی کی شادی یا سالگرہ ہوتی تو بڑھیا سے بڑھیا تحفے لے جاتے مگر وہ ایسے موقعوں پر مہینہ پہلے سے کہیں اور مدعو ہوتے اس لیے آنے سے معذور ہوتے۔

"ارے تو کیا اب ریاض سے کہوں کہ رشوت لو۔ بلیک میلنگ کرو۔" بیگم ریاض نے بستر سے اچھل کر اتر تے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا اور چائے پینے بیٹھ گئیں۔ اس وقت جب کہ وہ خود کو نہایت دیانت دار اور شریف بیوی محسوس کر رہی تھیں تو مسز ملک ہانپتی آ گئیں۔

"ہائے کیا ٹھاٹ سے بیٹھی چائے پی رہی ہو۔ ہمارے بچے تو ایک گھونٹ سکون سے نہیں لینے دیتے۔ کیسے سدھایا ہے تم نے اپنے بچوں کو؟" بیگم ملک رونی صورت بنا کر عادتاً ہانپنے لگیں۔ بے چاری ہمیشہ بیگم ریاض سے مرعوب رہتیں۔

"بس کوئی خاص کوشش نہیں کرنا پڑی۔" بیگم ریاض نے ان کے لیے چائے بناتے ہوئے بے حد انکسار سے جواب دیا لیکن اندر سے پھول گئیں۔ صبح سے اب تک نئی پڑوسن کے تذکروں نے انہیں بھیگے اسفنج کی طرح احساس کمتری میں جکڑ لیا تھا۔

"سلیمہ کے بچے بھی بڑے تمیز دار ہیں۔ ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے ہیں مگر مجال ہے کہ چوں بھی کر جائیں یا کپڑے خراب کر لیں۔" بیگم ملک نے بڑے بڑے دیدے نکال کر ہانپتے ہوئے کہا۔

"کون سلیمہ؟" بیگم ریاض نے آہستہ سے پوچھا۔

"ارے تم نہیں جانتیں؟ تمہیں اتنی بھی خبر نہیں کہ تمہارے پڑوس میں سلیمہ رفیع آ گئی ہیں۔" بیگم ملک کے دیدے بیگم ریاض کی بے خبری پر اور بھی پھٹ گئے۔ اور بیگم ریاض کے منہ میں چائے کا گھونٹ کڑوا ہو گیا۔

"کون ہیں یہ لوگ۔" بیگم ریاض نے بظاہر لاپروائی سے پوچھا۔

''ارے تم نہیں جانتیں؟ ارے بھی منصوری صاحب کا نام تم نے نہیں سنا؟ گلبرگ میں رہتے ہیں۔ کیا شاندار کوٹھی بنائی ہے۔''
بیگم ملک بے حد مرعوب تھیں۔

''ہوں گے۔ بہت رہتے ہیں گلبرگ میں۔'' بیگم ریاض نے کہنا چاہا۔

''واہ منصوری صاحب کو کون نہیں جانتا۔ تو تم نہیں جانتیں۔ ہمیں لائل پور میں مربعے بھی نہ ملتے اگر منصوری صاحب نہ چاہتے۔''
بیگم ملک نے منصوری صاحب کی بڑائی کا سب سے بڑا ثبوت اپنی طرف سے مہیا کیا۔

''آپ جانتی ہیں کہ مجھے زمین و مین کے قصوں سے دلچسپی نہیں۔ پھر مجھے یہی یاد نہیں رہا کہ آپ جاگیردار بھی ہیں۔ آپ جانتی ہیں میں تو انسانوں سے ملتی ہوں ان کی املاک سے نہیں۔ مجھے تو انسان کی ذاتی لیاقت متاثر کرتی ہے۔'' بیگم ریاض نے بڑے سکون سے انہیں سمجھانا چاہا۔

''ارے سلیمہ خود بڑی لائق ہے۔ اور ابھی منصوری صاحب کی بہو ہے۔ بڑی بھاگوان عورت ہے سسرال کے لیے۔ میں تو صاف کہوں گی'' بیگم ملک نے پھر بیگم ریاض کو چت کرنا چاہا۔

''یہ بھاگوان ہونا یا منحوس ہونا بھی محض اتفاقات ہوتے ہیں میں ان باتوں پر یقین نہیں کرتی۔'' بیگم ریاض نے پھر مدافعت کی۔

''لیجیے بھاگوان ہونے پر بھی یقین نہیں؟ حد ہے۔ آپ بزرگوں کی ساری باتوں کو جھوٹ کیسے کہہ سکتی ہیں۔ عورت گھوڑا اور زمین یا تو بھاگوان ہوتے ہیں یا منحوس۔ اب سلیمہ رفیع کو کون بھاگوان نہیں کہے گا۔ رفیع کو منصوری صاحب ایک دم نالائق سمجھتے تھے۔ انٹرمیڈیٹ بہت بڑی مشکل سے پاس کیا۔ چیفس کالج میں پڑھوایا تھا مگر کتنی بار لڑھکے۔ دوسرا بیٹا ڈپٹی کمشنر لگا اور یہ رفیع بس باوا کی موٹر لیے گھومتے تھے۔ بیگم منصوری بے چاری کو رفیع کا بڑا غم تھا۔'' بیگم ملک کہتی گئیں۔ اور بیگم ریاض خاموشی سے ان کی طرف بڑی نمایاں سرد مہری سے دیکھتی رہیں۔ لیکن اندر سے ان کا جی نہیں چاہتا تھا کہ بیگم ملک ہانپنے کے لیے بھی رکیں اور جب بیگم ملک چائے کے چند گھونٹ تابڑ توڑ لینے کے لیے چپ ہوئیں تو بیگم ریاض اپنا رکھ رکھاؤ بھول گئیں۔

''پھر؟''

''پھر دیکھئے سلیمہ سے اس کی محبت ہوگئی۔ سلیمہ کے بابا کو رفیع ایک دم ناپسند تھا اور منصوری صاحب بیٹے سے ناخوش تھے۔ اس لیے چپکے سے دونوں نے شادی کرلی۔ منصوری صاحب کہتے تھے۔ شادی کرلی نالائق نے اپنی مرضی سے مگر دیکھیں کھلائے گا کہاں سے بیوی کو۔ اور سلیمہ کے ابا سمجھتے کہ اب دونوں بھوکوں ہی مریں گے۔ ادھر رفیع کی امی کو یہ غم تھا کہ اتنے بڑے جاگیردار گھر میں وہ

رفیع کا رشتہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ کہ چلو نوکری کے لائق نہیں تو اچھی سسرال ہی مل جائے گی۔" بیگم ملک نے دوبارہ کہانی کے نہایت دلچسپ موڑ پر چائے کے گھونٹ پر گھونٹ اتارنا شروع کر دیئے۔

"پھر؟" بیگم ریاض آپ کے نہایت اشتیاق سے بول پڑیں۔

"پھر قائل ہو جایئے کہ بھاگوان عورت کیا کرتی ہے۔ رفیع ایک فرم میں منیجر ہیں۔ کوئی ہزار تنخواہ ملتی ہے۔"

"ہزار روپے انٹر پاس کو؟" بیگم ریاض بے یقینی سے بولیں۔

"کیوں؟ فرم میں کوئی لیکچر دینا ہوتے ہیں۔ پھر دنیا جانتی ہے کہ رفیع منصوری صاحب کا بیٹا ہے۔ پھر کیا انگریزی بولتا ہے کہ ملک صاحب تک اس کے سامنے اٹکنے لگتے ہیں۔ بیوی ایسی سلیقہ مند ملی کہ گھر میں کیا کچھ نہیں۔ باپ اور سسر کو شرمندہ کر دیا۔ ماشاء اللہ سے بڑی پوزیشن والوں میں میل ملاقات ہے۔ اپنے خاندان کا اسٹینڈرڈ فیس کرنے دیا۔"

"ہائے اللہ تین سو کرایہ ہے اس گھر کا۔" بیگم ریاض نے حساب لگایا کہ اس کے بعد کیا بچا۔

"اور کیا' پھر بھی جا کر دیکھو کیا رہن سہن ہے۔ حالانکہ نہ جہیز لائی نہ سسرال سے کوئی مدد۔ کتابوں کا شوق ماشاء اللہ سے تمہاری طرح سلیمہ کو بھی ہے۔ مگر ساتھ میں عورت کو سلیقہ تمیز بھی ہو تو وہ گھر کے لیے بھاگوان کیوں نہیں ثابت ہوگی۔ ارے بھاگوان ہونے کے لیے کوئی سرخاب کے پر تو نہیں لگے ہوتے عورت ذات ہیں۔" بیگم ملک روانی میں کہے چلی گئیں اور بیگم ریاض کے ہاتھ سے خالی پیالی گرتے گرتے بچی۔ انہیں یوں لگا کہ بیگم ملک نے ان کے منہ پر سے آئیڈیلزم کا لیپ اتار کر کالک مل دی ہے۔

"اچھا بھئی چلوں اب۔ ڈرائیور گاڑی لے کر کلب جائے گا۔ ملک صاحب کو وہاں سے کہیں اور جانا ہے۔ میں تو ادھر سلیمہ کے پاس آئی تھی سو چا تم سے بھی ملتی چلوں۔ ارے آؤ نا ہماری طرف۔ اب تو ٹیکسیاں بہت ملنے لگی ہیں دوری کا بہانہ بھی نہیں رہا۔ ہاں تانگے میں بے شک ہمارے ہاں آتے بہت دیر لگتی تھی۔"

بیگم ملک رخصت ہوئیں تو بیگم ریاض جیسے منوں بوجھ تلے دبی ہوئی تھیں۔ بیگم ملک نے صاف ان کی ذات پر چوٹ کی تھی۔ انہیں مولوی نذیر احمد کی "مراۃ العروس" والی اصغری خانم اور پڑوس کی سلیمہ رفیع اپنے سے زیادہ حقیقی عورتیں معلوم ہو رہی تھیں۔ انہیں اپنی نانی بھی یاد آئیں جو ہمیشہ اسے کتابوں کی بجائے گھر داری میں جی لگانے کا مشورہ دیا کرتی تھیں۔ انہوں نے ایک بار پھر اپنے گھر کے اخراجات کی کاپیاں اٹھا کر دیکھنا شروع کیں۔ اور ایک دم اپنے میاں کے اخراجات کی فہرست الگ بنا ڈالی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ ٹیکسی سگریٹ اور دفتر میں چائے کا خرچ کوئی تین ساڑھے تین سو روپے ماہوار کا تھا۔ پھر اپنے اخراجات کی فہرست اکاؤنٹ

تک آمدورفت کا کرایہ ٹھیک ہے۔ مگر یہ اسٹاف اور یتیم شاگردوں کو کھلانے پلانے کی ایسی کیا ضرورت ہے۔ اور پھر تنی بہت سی غریب لڑکیوں کی فیس اور کتابوں کا خرچ۔ اتی غریب ہے تو میں سب کو اکیلی تو نہیں سمیٹ سکتی" وہ ہر یہ مائی جانو کے ساتھ دو اور کھانے والے' اللہ کی پناہ صرف اس گھر میں آنے کا خرچ تین سو ہے۔ پھر بھی اٹھ کر یہ نہیں دیکھ کہ نوکر واقعی اتنی ہی چیز لایا ہے جتنی حساب میں لکھ رہا ہے۔ اور پھر یہ ساڑھے تین سو صرف مکان کا کرایہ!

اسی وقت ریاض صاحب آ گئے۔ بیگم ریاض تو بھری بیٹھی تھیں۔ ایک دم ان کے اخراجات پر تنقید شروع کر دی کہ آپ چائے وغیرہ اس قدر کیسے پی جاتے ہیں۔ ریاض صاحب بھونچکے رہ گئے لیکن مزاج کے ٹھنڈے تھے اس لیے کہنے لگے "کیسی باتیں کرتی ہو۔ دو سو روپے دوسروں کو چائے سگریٹ وغیرہ پلانے کا الاؤنس ملتا ہے۔ بے ایمانی کروں اور اسے بچت میں ڈال دوں؟"

"میں کب کہتی ہوں کہ بے ایمانی کیجیے مگر یہ حقیقت ہے کہ ہم دونوں ہی فضول خرچی کرتے ہیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ دیکھیے ٹیکسی کا خرچ!"

"تو پیدل چلا کریں؟"

"آخر اور لوگ بھی ہماری آمدنی کے زمرے والے ہیں بلکہ اس سے بہت کم آمدنی والے۔ ان کے پاس کیا کچھ ہے؟"

"تو تم بھی وہ سب لے سکتی ہو تو لے لو۔ تنخواہ تو تمہارے ہی ہاتھ آتی ہے۔"

ریاض صاحب اتنا کہہ کر ایسے گھبرائے کہ بھاگنے کا بہانہ ڈھونڈنے لگے۔ اسی وقت اتفاق سے ایک دوست کا ٹیلی فون آ گیا جس نے انہیں کسی پرانے دوست سے ملنے کے لیے دعوت میں بلا لیا۔

بیگم ریاض اکیلی ہو کر اور بھی بے چین ہو گئیں۔ میاں کے ساتھ بحث کر کے وہ اور بھی پریشان ہو گئی تھیں۔ ٹھنڈے دل سے سوچا تو انہوں نے جتنے بھی فالتو اخراجات پکڑے تھے وہ فالتو نہ تھے۔ مثلاً مائی جانو کے بجائے کوئی اور آیا ہوتا تو وہ کھانا صرف اپنا بیتی لیکن تنخواہ ساٹھ سے کم کیا لیتی؟ اور غریب لڑکیوں کی مدد کوئی اتنی غیر اہم بات بھی نہ تھی۔

جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو وہ گھبرا کر کمرے سے باہر نکلیں اور دالان پر جا کر بیٹھ گئیں۔ ان کے تینوں بچے ہنس رہے تھے اور بید کی کرسیوں پر کود رہے تھے۔ بیگم ریاض مطمئن اور خوش بچوں کو دیکھ کر خود بھی یک گونہ خوش اور مطمئن ہو گئیں۔

"امی ہم پڑوس میں کھیلنے چلے جائیں؟" اچانک سیما بولی۔

ریاض بیگم کو پھر جیسے کسی نے جھنجوڑ دیا۔ "کیوں وہ کیوں نہیں آ جاتیں؟

اچانک وہ حاسد بن گئیں۔

"ان کی لڑکی نے ہمیں بلایا تھا۔ امی اتنی اچھی پھولی پھولی فراک پہنے تھی وہ جیسے ہم پارٹی میں پہنتے ہیں۔ میں نے پوچھا تمہارے ہاں پارٹی ہے؟ تو وہ کہنے لگی نہیں۔" میں نے پوچھا پھر پارٹی فراک کیوں پہنا تو کہنے لگی امی تو روز ہی ہم کو ایسے کپڑے پہناتی ہیں۔

"امی ہمیں بھی بہت سی فراکیں بنا دیجئے۔" سیما امی کے کندھے سے لگ کر کہتی رہی اور بیگم ریاض کے جسم کی ساری رگیں اس طرح تن گئیں کہ اگر کوئی انہیں ذرا سا بھی چھو جاتا تو ان سے بج اٹھتیں۔ بیگم ریاض ذرا اس عورت کا منہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ جس نے ہر ایک کا دل جیت لیا تھا۔

انہوں نے خود جا کر صدری سے بچوں کے بہترین کپڑے اور اپنے لیے عمدہ سی ساری نکالی اور ماں سے کہا کہ جا کر کہہ دے بیگم ریاض ملنے آ رہی ہیں۔

تازہ ترشی ہوئی گھاس پر بید کی چار رنگین ٹوکریوں جیسی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔

نیلی، سبز، زرد اور سرخ۔ مالی پینٹ کیے ہوئے گملوں میں پانی دے رہا تھا۔ اور سلیمہ رفیع ہلکے سبز سوٹ میں مسکراتی چمکتی ڈرائنگ روم کے دروازے کے سامنے کھڑی تھیں۔

"آیئے، ابھی اندر بیٹھیں، باہر سورج کی چمک پڑتی ہے۔ بچے باہر ہی کھیلیں گے۔" سلیمہ رفیع ایسے انداز سے بولیں کہ بیگم ریاض کی تنی ہوئی رگیں اتنی تن گئیں کہ وہ مسکرا بھی نہ سکیں

ابھی بیگم ریاض ڈبل صوفہ سیٹ پر ایک نظر ڈال کر بیٹھ بھی نہ پائی تھیں کہ گولڈن رنگ بے حد حسین گلاسوں میں سامنے آ گئی اور وہ ان حسین گلاسوں پر نظر جما کر خود کو گنوار نہیں ثابت کرنا چاہتی تھیں اس لیے سامنے دیکھنے لگیں۔ آتشدان پر تجریدی آرٹ کے رنگوں سے تھپے ہوئے ایک نمونے پر نگاہ پڑ گئی۔

"یہ ۔ کی پینٹنگ ہے۔ انہوں نے کہا اسے آپ رکھے آپ اس کی قدر جانتی ہیں" آرٹ کے بارے میں۔ سلیمہ نے بے حد پرستانہ انداز سے بتایا۔

اور بیگم ریاض کی رگیں اپنے معمول پر آنے لگیں۔ اب یہ ان کی دلچسپی کا موضوع تھا۔

"مگر یہ تجریدی آرٹ محض بکواس ہے" بیگم ریاض نے اعتماد سے کہنا شروع کیا۔

"مگر دیکھیے تو" سلیمہ نے بات کاٹی۔

"کہ کر مگر کی جائے اس سلسلے میں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ کیمرے کی ایجاد کے سامنے مصور کے عجز کا اعتراف ہے یہ تجریدیت۔"

بیگم ریاض بولتی گئیں مگر جب وہ اس زور شور سے بول رہی تھیں تو انہوں نے دکھا کہ سلیمہ کا نازک سا گورا ہاتھ اس حسین بک شیلف پر بڑے اعتماد سے رکھا ہوا ہے۔ جس میں بہترین جلدوں کی کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ اور یہ کتابیں ادب آرٹ سیاست اور فلسفے سے متعلق تھیں۔

بیگم ریاض جیسے سوکھے پتے کی طرح الاؤ میں گر کر چرمرا گئیں۔ "آپ کے میاں کو کتابوں کا شوق ہے۔ مگر یہ موضوعات ان کو"

"جی نہیں۔" سلیمہ نے بات کاٹی۔ "یہ میرے شوق کی چیزیں ہیں۔ رفیع تو کچھ پڑھتے نہیں۔ پڑھیں بھی تو بچوں کے کامک پڑھ کر بھی خوش ہو لیتے ہیں۔"

اور بیگم ریاض سلیمہ کے اس جواب کے بعد راکھ ہو گئیں مگر امتحان لینے کی عادت تھی اس لیے انہوں نے دو چار سوال ادب اور فلسفے کے بارے میں کر ڈالے اور جب سلیمہ نے جواب دیے تو بیگم ریاض کا سب سے اہم اور آخری مورچہ سر ہو چکا تھا۔

تو ان کے پڑوس میں ایک مکمل عورت آ بسی تھی گویا؟ خوبصورت، خوش لباس، سلیقہ مند اور باذوق عورت بیگم ریاض اس کے سامنے شریف دشمن کی طرح ہتھیار پھینک کر جھک گئیں۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے آپ کو چھپا نہ پاتیں۔ عورت پن کھلتا تو مصلحت وغیرہ نہ دیکھتیں۔ اپنی عادتوں، اپنے گھر اور اپنے اخراجات تک کا تذکرہ کر ڈالا اور جی کھول کر سلیمہ کی تعریف کی۔ انہوں نے مان لیا کہ سلیمہ بے حد سلیقہ شعار خاتون ہیں۔

پھر جانے کیوں لان میں جانے کے لیے اٹھتے اٹھتے وہ پوچھ بیٹھیں۔ "بیگم ملک کہہ رہی تھیں کہ آپ کے میاں کو ایک ہزار تنخواہ ملتی ہے۔ تنی تنخواہ میں بڑے سلیقے سے رہتی ہیں۔ میں تو قائل ہو گئی آپ کی۔ میں تو اپنی بیٹی کی تربیت اس انداز سے کروں گی کہ وہ آئندہ ایک اچھی گھریلو عورت بھی ثابت ہو سکے۔"

"جی۔ جی ہاں، بس اسٹینڈرڈ قائم رکھنا ہی پڑتا ہے زندگی میں۔ اسے سلیقہ کہیے یا تمیز۔" سلیمہ رفیع مدھم آواز میں بولیں مگر بیگم ریاض نے دیکھا کہ اس بظاہر سنجیدگی اور انکسار کے باوجود وہ خوشی سے چمک گئیں۔ شفق کے سرخی نے گرین سوٹ میں ملبوس سلیمہ کو

طلسم کا حسین بنا ڈالا تھا۔ وہ سرخ رنگی ہوئی ٹوکری نما کرسی میں بیٹھ کر اور بھی دلکش نظر آ رہی تھی۔

بیگم ریاض نے دیکھا کہ سیمہ کے بچوں کے سامنے ان کے اپنے بچے کچھ دبے دبے اور جھینپے جھینپے سے تھے۔ وہ سب میز پر بکھرے ہوئے کانک اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ بچوں کو اتنے رکھ رکھاؤ سے نہیں چاہیے۔ بچے تو ہنستے کودتے اور شرارتیں کرتے ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھئے تو اس وقت یہ سب بچے کتنے بڑے اور بور معلوم ہو رہے ہیں۔" بیگم ریاض ہنستے ہوئے کہنے لگیں۔

"جی لیکن کیا کیا جائے" بچے شروع سے سوسائٹی کے معیار کا احترام کرنا نہ سیکھیں تو بعد میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ماں باپ نہ سکھا سکیں تو باہر کی دنیا انہیں بے دردی سے سکھاتی ہے اور پھر وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔" سیمہ عجیب بے بسی سے بولیں۔

بیگم ریاض سوسائٹی اور فرد کے موضوع پر کتنی دیر بول سکتی تھیں یہ انہیں خوب معلوم تھا۔ لیکن ان کی عادت تھی کہ جب وہ کسی کے ایک پہلو سے متاثر ہوتیں تو اس کے ہر آڑے ٹیڑھے پہلو کو نظر انداز کر جاتیں اور بحث ضروری نہ سمجھتیں۔ پھر بھی انہیں رحم آیا کہ وہ یہ بات کیوں نہیں سمجھتی کہ یہ طبقاتی سوسائٹی ہے۔ وہ پوچھنا چاہتی تھیں کہ آپ کس سوسائٹی کا ذکر کر رہی ہیں؟ اور بچوں کو کس معیار کے مطابق ڈھال رہی ہیں لیکن نہ پوچھ سکیں کیونکہ اس وقت باہر سے ایک کار اندر آ گئی۔ لمبی سی سیاہ نئی کار۔

"گڈ ایوننگ ڈیڈی" سیمہ کے بچے یک زبان ہو کر بولے اور پھر کامک پر جھک گئے۔

"گڈ ایوننگ۔" لمبے سے خوبصورت مرد نے موٹر سے اترتے ہوئے جواب دیا۔

سیمہ نے مسکراتے ہوئے تعارف کرایا۔ "یہ رفیع ہیں اور یہ ہماری پڑوسن۔"

رفیع بڑے سٹائل سے ذرا خم ہوئے۔ اور بیگم ریاض کو پڑوسن کا لقب بڑا اریٹیٹنگ لگا۔

"ارے آپ اتریئے تو سہی۔ رفیع کچھ گھبرائے سے دوبارہ موٹر کی طرف گئے۔ اور اسٹیئرنگ وہیل پر منہ رکھ کر دوسری طرف جھکے ہوئے شخص کے لیے کار کا دروازہ کھول دیا۔ اور جیسے وہ شخص زبردستی باہر نکلا۔

"یہ رائل موٹرز کے ڈائریکٹر مسٹر زمان ہیں اور یہ میری بیوی سیمہ اور یہ۔ یہ پڑوسن ہیں۔" رفیع نے تعارف کرایا۔

اور مسٹر زمان ایک دم بیگم ریاض کی طرف متوجہ ہو گئے اور بیگم ریاض پلکیں جھپکا کر زمان کی حیران سے دیکھنے لگیں۔ سیمہ اور رفیع ان دونوں کو سمجھنے کے لیے پلکیں جھپکانے لگے۔

"کیسے بہت دن میں ملاقات ہوئی۔ ریاض صاحب کیسے ہیں؟"

"اچھے ہیں۔" بیگم ریاض نے جواب دیا۔

"ارے آپ کی سیما تو بڑی سی ہو گئی۔" زمان نے سیما کو بیگم ریاض کا پلو پکڑے دیکھ کر کہا۔ اور بیگم ریاض صرف مسکرا دیں۔ وہ جانے کے لیے کھڑی تھیں۔

اور جب وہ گیٹ سے باہر نکلیں تو قدرے تھکی ہوئی تھیں لیکن یہ تھکان ویسی ہی تھی جیسے کوئی بچہ گھر کے گھٹے آنگن سے نکل کر خوبصورت باغ میں پھر تا رہا ہو۔

مگر وہ تو تھوڑی سی اداس بھی تھیں۔ یہ اداسی کیسی تھی؟

کیا وہ سلیمہ کے آگے احساس کمتری میں مبتلا ہو گئی تھیں؟

وہ اپنے گھر نہیں گئیں شام کے اندھیرے میں ڈوبتی ہوئی لمبی سڑک پر بچوں کی انگلیاں تھامے آگے بڑھتی گئیں بے مقصد بے ارادہ۔ مگر ان کی اداسی شام کی طرح گہری ہوتی گئی۔

سڑک کے دو رویہ درختوں پر بسیرے کے لیے شور مچاتی ہوئی چڑیوں کی آوازیں بڑی عجیب معلوم ہوئی بڑے شہروں کی سڑکوں پر تو موٹروں اور تانگوں کی آوازیں تک عادی ہوتی ہے کہ راہ چلتا اپنے حواس بھی گم کر دیتا ہے۔ پھر آج جانے کیسے انہوں نے چڑیوں کی آوازیں سن لی۔ آخر اداسی میں سناٹا کیوں ہوتا ہے۔ بیگم ریاض نے چلتے چلتے اپنے آپ سے پوچھا؟ اور پھر انہیں ایک دم دھیان آ گیا کہ وہ اداس کیوں ہیں۔"

زمان کو دیکھ کر بھلا اداس ہونے کی بات کیا ہے؟" وہ اس وقت چاہتیں تو زمان کے بڑھتے قدموں کو بڑھنے دیتیں • مگر انہوں نے خود ہی اس سے کترا کر نکل جانا پسند کیا۔ اور ریاض کی ہو گئیں۔ زمان کے پاس موٹر اس وقت بھی تھی لیکن وہ دماغ تو نہ تھا۔ زمان نے شادی کے بعد تک ان کا پیچھا کیا لیکن بیگم ریاض نے اسے سختی سے جھڑک دیا۔ اور ریاض کو بتا دیا کہ زمان میرا امیدوار رہ چکا ہے اس میں پسند نہیں کرتی کہ تم اسے گھر پر آنے دو۔

پھر سنا کہ زمان نے شادی کر لی اور کئی بچوں کا باپ بن گیا۔ اس کا کاروبار لاکھوں کا ہو گیا۔ لیکن بیگم ریاض نے کبھی اس کے بارے میں نہ سوچا۔ کبھی اس سے نہ ملیں۔ ان دونوں کے میل جول کے حلقے ہی الگ تھے۔ لیکن آج زمان کو چڑوں میں دیکھ کر وہ اداس ہو گئیں۔

"ارے کبھی کبھار آتا رہتا تو کیا میرے ہیرے موتی توڑ لیتا؟" بیگم ریاض نے اپنے آپ سے پوچھا اور ناک کی سیدھ چلتی

گئیں۔ بچے تھک چکے تھے انہیں اس کا بھی خیال نہ آیا۔

ہنہ مگر میں اس سے کیوں ملتی صرف اس لیے کہ وہ امیر آدمی ہے۔ اس کی موٹر ہمیشہ نئی ہوتی ہے۔؟ تو پھر! آخر میں بھی سوچنے لگی عام لوگوں کے دماغ سے۔ میں تو اسے ٹھکرا چکی ہوں! ایسے لوگ میرے معیار کے نہیں۔ دماغ میں گوبر بھرا ہوا ہے۔ میں تو سیمہ کو بتاؤں گی کہ تمہارے میاں کی فرم کے بہت اہم ڈائریکٹروں کو میں جوتے کی نوک پر مار چکی ہوں۔ بلکہ اس کا داخلہ اپنے گھر میں بند کرو چکی ہوں۔" بیگم ریاض کی انا کو اس خیال سے بڑی تسکین ہوئی۔

"ہی گھر چلئے اب۔" سیمہ نے تھک کر جیسے فریاد کی اور بیگم ریاض کو حیران ہوئی کہ وہ اپنے گھر سے کتنی دور نکل آئی تھیں۔ گھر کی طرف لوٹتے ہوئے انہوں نے اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑا تو۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا۔

"ارے میرا بیٹا تھک گیا۔؟" بیگم ریاض نے بچے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبایا تو انہیں علم ہوا کہ اس کے ہاتھ میں کانچ کی گولیاں تھیں۔

"ارے یہ چوری؟ چلو ابھی واپس کرو یہ گولیاں" بیگم ریاض صدمے سے چلا اٹھیں۔ جب وہ ننھی سی تھیں تو پڑوس سے گڑیا کا دوپٹہ اٹھا لائی تھیں۔ اس بات پر ان کی امی نے خفائی الگ کی اور دوپٹہ بھی اس کے ہاتھ سے واپس کروایا۔ جب سے کسی دوسرے کی بھول کر چھوڑی ہوئی چیز بھی ان کے دل پر بوجھ بن جاتی تھی۔

"نہیں انہوں نے خود دیے تھے" بچے نے احتجاج کیا۔

"اچھا چلو پوچھتے ہیں ان سے۔" بیگم ریاض نے کہا اور سیمہ کی کوٹھی کے پھاٹک تک وہ بچے کا ہاتھ پکڑے چپ چاپ چلی آئیں۔ اچانک پھر انہیں عجیب سا لگا کہ وہ رمان کو دیکھیں گی۔ اور شاید انہیں زمان کے سامنے ہی بچے کے ہاتھ کی ہوری گولیاں پیش کرنا پڑیں گی۔ سیمہ کیا کہے گی اور رفیع اسے کیا سمجھے گا۔ اور ان دونوں کے مہذب بچے میرے بچے کے بارے میں کیا سوچیں گے۔

تو کیا وہ اس وقت گندے کے سامنے شکست کھا جائیں؟

عجیب سی کشمکش کے عالم میں وہ پھاٹک کے باہر گندے کا ہاتھ سختی سے پکڑے کھڑی تھیں۔

اس وقت جیٹ طیارے کی سی تیزی سے زماں کی کار پھاٹک سے نکلی۔ بیگم ریاض نے دیکھا اور جھجک کر ادھر سے پیٹھ کر لی۔

اب وہ اندر جانے کی ہمت کر سکتی تھیں۔

مگر وہ دیکھ کر ذرا آگے نہ بڑھ سکیں کہ خوبصورتی سے ترشے ہوئے لان کا نقشہ ذرا سا بگڑ گیا تھا۔ بید کی رنگین لوکریوں جیسی کرسیاں

اسی طرح فلور لیمپ کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ نیلی کرسی پر ٹونی اپنا کاڈیوائے سوٹ پہنے بیٹھا تھا۔ پیلی کرسی پر نرگس بے حد خوبصورت سرخ فراک پھیلائے بیٹھی تصیری سبز کرسی پر رفیع اپنے گرے سوٹ میں اسی طرح اسمارٹ لگ رہا تھا۔ اور چوتھی سرخ کرسی خالی تھی۔ اس سرخ ہالے میں سیمہ رفیع کا سبز سوٹ اس وقت کتنا مکمل رہا تھا لیکن یہ کرسی اب خالی تھی کیونکہ سیمہ رفیع تو زمان کی کار میں بیٹھ کر کہیں چلی گئی تھی۔

بیگم ریاض نے کالک کی رنگین کتابوں پر جھکے ہوئے ٹونی نرگس اور رفیع کو چونکانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اپنے کندے کا ہاتھ پکڑے اپنے گھر کی طرف لوٹ گئیں کیونکہ سیمہ رفیع کے باورچی خانے میں مرغ روسٹ ہونے کی خوشبو سے خود انہیں بھوک لگ آئی تھی

رات ریاض صاحب آئے تو بیگم ریاض کا موڈ بے حد اچھا تھا۔

چند دن بعد بیگم ملک نے بیگم ریاض کو اطلاع دی۔ کہ ''ارے تمہیں کچھ خبر ہے۔ رفیع اب اپنی فرم میں ڈائریکٹر ہو گیا ہے۔ خدا کی قسم کیا مبارک عورت ہے یہ سیمہ بھی۔''

◆◆◆

عاقبت

"اے بابا دیکھو ایک موٹر آ رہی ہے۔" رہٹ پر بیٹھے ہوئے خانو کی چابک بیل کی پسلیوں میں گڑی کی گڑی رہ گئی اور رہٹ کے چکر کے ساتھ اس کی گردن مڑتی ہی چلی گئی۔

سبزی ترکاری کی بڑی بڑی کیاریوں میں پانی کی نالیاں درست کرنے والے بوڑھے نے آنکھیں میچ کر سڑک کی طرف دیکھا اور دور سے بولا "ہاں اب بڑا عام رواج ہے نا پہلے تو برسوں کوئی نہ آتا تھا۔ اب موٹروں پہ موٹریں بھر بھر کر آ رہی ہیں۔ جیسے حج کرنے جو کرتا ہیں... . ہا آ . یہ آل اولاد کی بڑی بے ایمان چیز ہے۔"

کالے رنگ کی بڑی سی کار دھول میں اپنی ہچکولے کھاتی قریب سے گزری تو خانو اور اس کے باپ نے ماتھے پر ہتھیلی سامنے کر کے اپنے حساب بے صدا چھوڑ یعنی سلام کیا۔

"سنا ہے شہر میں ملک کے سب بچے بنگے پھرتے ہیں اور بیبیاں برقع بھی نہیں اوڑھتیں۔" خانو نے لپک کر موٹر کو دیکھا جس میں پہلے آنے والی موٹروں کی طرح شیشوں پر رنگین پردے چڑھے ہوئے تھے۔

اب موٹر اس کالی رو حویلی کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی جس کا طرز تعمیر اس سارے ماحول میں بڑا اجنبی سا لگتا تھا۔

"تو جی آخر بڑے پوتے بھی پہنچ ہی گئے۔" بوڑھے ریٹائرڈ فوجی رمضان علی نے کھاٹ پر سے اٹھ کر سیلوٹ مارا اور پھر اباؤٹ ٹرن ہو گیا تاکہ موٹر میں آنے والی بیبیاں زنان خانے کی ڈیوڑھی میں داخل ہو جائیں۔ رمضان علی بیک وقت اس حویلی والے کی زمینوں کا منتظم بھی تھا اور حویلی کا چوکیدار بھی۔ جب وہ موٹر کے دروازے بند ہونے کی آواز کے ساتھ مڑا تو دیکھا جمیل میاں اپنا ڈاکٹروں والا بیگ اٹھائے سیدھے ڈیوڑھی کی طرف جا رہے ہیں۔

"پہلے ادھر آ جاؤ بیٹا جمیل۔" مردانہ بیٹھک سے ابا جان کی رعب دار آواز ابھری تو وہ بادل ناخواستہ ادھر ہی مڑ گئے۔

اونچے کٹاؤ دار محرابی برآمدے سے گزر کر وہ لمبے سے سرد سے کمرے میں داخل ہوئے جس کے ہرے رنگ کے دانے دار شیشوں سے مزین دروازے بند تھے اور کمرے میں ٹھنڈا اداس اندھیرا تھا۔ دھوپ سے آتے ہوئے جمیل کی نظروں میں کچھ زیادہ ہی گہرا تھا۔ درمیان میں اونچی نشستیں آبنوسی میز تھی وہ اس سے ٹکراتے ٹکراتے سنبھلے اور پھر اپنا بیگ اسی پر رکھ دیا۔ مگر اس کے ہینڈل پر

سے ہاتھ دھنا اٹھایا۔

کمرے میں ڈاکٹر جمیل کے ابا کے علاوہ دونوں چچا، پھوپھا اور کئی پھوپھی زاد اور چچا زاد موجود تھے وہ سب الگ الگ شہروں سے آئے تھے۔ اس لیے ایک دوسرے آگے بڑھ کے ملے اور سلام دعا کی۔

"راستہ بہت خراب ہو گیا پچھلی برسات میں۔ ہم تو بہت پریشان ہوئے۔ تمہاری موٹر کے ٹائر پنکچر نہیں ہوئے جمیل میاں؟" پھوپھا نے پوچھا۔

"جی نہیں تو۔ کیا حال ہے دادا میاں کا؟" جمیل نے سوال کیا

سب کے چہروں پر مایوسی کا سایہ پھر گیا۔

"جمیل بیٹا تم پہلے منہ ہاتھ دھو لو اور چائے پی لو۔" بڑے چچا نے بڑی شفقت سے کہا۔

"جی میں تو پہلے دادا میاں کو دیکھ لوں۔ . . اجازت ہے؟" جمیل نے بیگ ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ ڈاکٹر صاحب ابھی تو ان کے پاس سے اٹھ کر ادھر آئے ہیں" جمیل کے ابا نے اطمینان دلانا چاہا تو جمیل نے اتنے بہت سے چہروں میں ان ڈاکٹر صاحب کا چہرہ تلاش کرنا شروع کیا اور وہ کونے میں چھپر کھٹ پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے نظر آ گئے مطمئن پر سکون چائے ہر گھونٹ پر اپنی سفید مونچھیں سنوارتا چہرہ۔

"جب دادا میاں کا حال اتنا خراب ہے تو پھر ڈاکٹر کو ہر وقت ان کے پاس ہونا چاہیے۔" جمیل نے کہنا شروع کیا مگر بات تیزی سے کٹ گئی۔

"جی جناب۔ ... آپ نہیں سمجھتے میں بیس سال سے ان کا علاج کر رہا ہوں۔ وہ اس وقت۔ ... میرا مطلب ہے کہ وہ اپنی حالت کو خوب سمجھ رہے ہیں۔ اس لیے اپنے پاس ڈاکٹر کی موجودگی پسند نہیں کرتے۔" قصباتی ڈاکٹر صاحب نے ہاتھ اور گردن کے اشاروں کے اضافے کے ساتھ جمیل کو بات سمجھانا چاہی۔

"میں سمجھ گیا ڈاکٹر صاحب!" جمیل اپنا بیگ لے کر کمرے سے نکلنے لگا۔

"اوہو بیٹے تم بات سمجھے نہیں۔ ڈاکٹر صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ ٹھہرو۔" جمیل کے ابا اپنی ہلکی سی جھکی کمر کو تان کر آگے بڑھے اور اپنے فرض شناس بیٹے کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر برآمدے میں نکل آئے۔ "بیٹا اب میں لڑکوں بالوں کے سامنے کیا کہوں تم سے۔" جمیل کے ابا نے کھسر پھسر کی۔ "دیکھو اس وقت اگر تمہارے دادا میاں کے پاس ڈاکٹر صاحب بیٹھے رہیں تو تمہاری دادی پردے کی وجہ سے

ان کے پاس سے ہٹ جائیں گی۔ اور تم جانو جو ایک عمر ایک دوسرے سے جو میں گھلے کو بھی جدا نہ ہوئے ہوں۔ وہ آخری وقت میں یہ کیسے برداشت کریں گے کہ ماں جان ان کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جائیں۔ تم نئے زمانے کے لوگ ان کی محبت کو کیا سمجھو گے ارے آج صبح سے تو ان کی آنکھیں بس تمہاری دادی پر ہی جمی ہیں جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں اور نہ کہہ سکتے ہوں۔ میں بھی سب کو ان کے کمرے میں جانے سے منع کر آیا ہوں اور یہ سب کہتے کہتے جمیل کے ابا کی آواز بھرا گئی۔

''جی۔ جی میں سمجھ گیا ابا جان میں تو بس ایک منٹ کو انہیں دیکھوں کا شاید کوئی نیا علاج سمجھ میں آ جائے میرے سامنے سے تو دادی کو نہیں ہٹنا پڑے گا۔ بس ایک نظر دیکھ آؤں۔'' جمیل نے سر جھکا کر درخواست کی۔

''اچھا جاؤ بیٹا'' اور ابا نے جمیل کا کندھا چھوڑ کر بیٹھک کا رخ کیا۔

آنگن میں باورچی خانے کی دیوار کے باہر تنور گرم تھا۔ تازہ خمیری روٹیوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی جمیل کی نظر مائی رانی پر گئی جو سر پر دوپٹے کو پگڑی کی طرح لپیٹے سینکی ہوئی روٹیاں سلاخوں کی مدد سے اکھیڑ کر ٹوکری میں جمع کر رہی تھی۔

''سلام مائی رانی'' جمیل نے زور سے کھنکھار کر آواز لگائی تا کہ زنان خانے میں بھری ہوئی چچیوں پھوپھیوں کے علاوہ ان کی بیٹیاں نواسیاں اور پوتیاں تک خبردار ہو جائیں اور سر ڈھک لیں جمیل کو اس وقت بھی اپنی دادی کی یہ بات یاد تھی کہ حویلی میں آؤ تو یہاں کے طور طریقے برتو ورنہ گھر میں کام کرنے والی عورتیں بھی باہر جا کر باتیں بناتی ہیں۔

مائی رانی کی بہو نے جلدی سے گھونگھٹ نکال لیا اور مائی رانی تو جیسے تنور میں اوندھے وندھے پڑی۔ جمیل نے دیکھا برے برآمدے میں سوئے چند بچوں کے کوئی نہ تھا۔ . . وہ آگے بڑھے تو پیچھے سے مائی رانی سلاخیں پھینک ان کے پیچھے دوڑی اور آٹے سے بھرے ہاتھ بے اختیار جمیل کے کندھوں پر پھیرنے لگی۔ ''صدقے پتر تو آ گیا۔ اب ملک کی دوا رو ٹھیک طرح ہو گی ...... مالک بڑے کمرے میں ہے.... ... مائی رانی نے بڑی رقت کے ساتھ کہا اور فوراً ہی تنور کی طرح لوٹ گئی کیونکہ اس نے روٹی جلنے کی بو سونگھ لی تھی۔

مائی رانی کے ہاتھ تنور اور آٹے سے الجھ رہے تھے مگر ذہن اپنے ملک کے گرد چمبیری کی طرح چکرا رہا تھا۔ اسے یاد نہ تھا کہ اس سے پہلے کبھی اتنی بڑی تعداد میں ملک کی آل اولاد حویلی میں اکٹھا ہوئی ہو۔ کوئی پچاس ساٹھ سال ہوئے ہوں گے جب ملک نے اس علاقے میں مربعے خریدے اور حویلی بنوائی۔

تبھی ایک دن اس کے خاوند نے کہا تھا ''نیک بخت مالک ہے تو باہر کا لیکن لگتا نیک ہے اس کے بال بچے آ رہے ہیں حویلی میں

چل کر روٹی پانی کا بندوبست کردے '' اور پھر پندرہ سال کی رانی نے موٹی موٹی روٹیاں پکاتے ہوئے گھونگھٹ کی اوٹ سے دیکھا تھا کہ لمبے سفید ریش تھے اور ایک بیٹے اور بیٹی کے ساتھ مالکن نئی حویلی میں داخل ہوئی اور جب مالکن نے برقع اتارا تو یوں لگا جیسے آنگن میں چاند اتر آیا ہو۔

عجیب عجیب سی خوشبو فضا میں پھیل گئی تھی۔ اس دن سے رانی نے مائی رانی بننے تک اسی باورچی خانے میں کیسے کیسے عجیب ناموں کے کھانے پکانے سیکھے . . . خدا نے مالک اور مالکن کی اولاد میں برکت دی۔ زمین میں برکت دی.... پھر ایک ایک کر کے سب حویلی سے چلے گئے مگر مالک اور مالکن کہیں نہ گئے۔ سوائے نذر نیاز کے موقعوں کے برسوں سے شاید ہی کبھی تنور گرم کرنا پڑا ہو۔ مائی رانی کتنے بہت سے دنوں سے دونوں وقت توے پر چار چھ پھلکے پکاتی جو مالک اور مالکن کے لیے بہت ہوتے۔ آہستہ آہستہ پھلکوں کی تعداد کم ہوتی گئی اور اب پچھلے مہینے سے وہ چند پھلکے بھی نہ پکے۔ مالک بیمار ہے تو پھلکوں کی کیا ضرورت ہے؟ مالکن کہتی ہیں۔ اللہ جانے ملک کے لیے جو یخنی بنتی ہے اس میں سے مالکن دو گھونٹ پیتی بھی ہیں یا نہیں۔ ان آٹھ دنوں میں مالکن کا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہو گیا۔ پھر بھی کیا رکھ رکھاؤ ہے مالکن کا.... . . مالکن کا..... . گھر میں بچے آئے ہیں اس لیے روز فجر کے وقت ہی بتا دیتی ہیں کہ آج یہ پکالو۔ مالک کے بیمار پڑتے ہی درخت میں جھولا ڈلوا دیا کہ ننھے بچے بہلے رہیں گے ورنہ اپنی ماؤں کو تنگ کریں گے جانے انہیں کیسے معلوم ہو کہ مالک کی اس بیماری پر ساری آل اولاد اکٹھا ضرور ہوگی۔ اور آج!... . آج تو سب سے عجیب بات ہوئی سویرے ہی بولیں "رانی آج آٹا زیادہ گوندھنا"۔ ہائے اللہ نے مالکن کا دل کیسا پہنچا ہوا فقیروں جیسا بنایا ہے ورنہ سبھی نے کہا تھا کہ جمیل میاں نہیں آسکیں گے۔ انہیں فرصت کہاں اپنے مریضوں سے اور اب وہ آ گئے اتنے دور سے۔

مائی رانی نے کراچی شہر کی دوری کا اندازہ کرنے کے لیے نیلے آسمان کی طرف نظریں اٹھائیں تو حویلی کی چمنی پر ایک چیل کو بیٹھے دیکھا "شو.... ..... شو.... .. " مائی رانی نے گرم سلاخ ہلا کر چیل کو دھمکایا.... . مگر وہ نہ اڑی۔

" ارے اس منحوس چیل کے دیدے پھوٹ گئے ہیں۔ ابھی ذرا دیر پہلے تو صدقے کا کالا بکرا بوٹی بوٹی ہو کر تمہارے پیٹوں میں چلا گیا۔ اور اب کس فکر میں ہو . . . شو... " رانی بڑبڑا کر چیل کو قائل کرنے لگی۔

" اماں روٹی تنور سے نکال۔ کیا اب کوئلہ بنانے لگی۔ بختو نے آٹے کے پیڑے بناتے ہوئے جھنجھلا کر کہا۔

مائی رانی چابی کے کھلونے کی طرح جھک جھک کر تیزی سے تنور سے روٹیاں برآمد کرتی ہوئی بڑبڑائی۔ " بختو تو ہی اٹھ کر اڑا دے اس کم بخت کو۔ اسی کمرے تلے تو مالک پڑا ہے . مجھے تو وہم ہوتا ہے . مالک کے بال بچے اس وقت کی روٹی کھا لیں۔

پھر تو اللہ کی مرضی آخر ہم نے ں کا نمک کھایا ہے۔"

مائی رانی نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں اپنے گھٹنوں پر پونچھیں اور پانی میں ہاتھ بھگو کر دھپ دھپ تنور میں روٹیاں کی تھپ لگانا شروع کر دی مگر بختو آنے کے پیڑے بنانے میں اتنی مصروف تھی کہ اس نے نحوس چیل کو صرف گھورنے پر اکتفا کر لیا جو ابھی تک چھت پر اڑھ جمائے تھی۔

"میرے بیاہ پر بھی کچھ تو دیا تھا مالکن نے..... آج تک نہیں سنا کسی زمیندار نے اپنے کمیوں کو بیاہ پر سونا بھی دیا ہو۔ کیسے بھاری کنگن تھے... ۔ ان پر کام بھی ایسا تھا کہ دور دور کے گاؤں والے دیکھنے آئے تھے وہ کنگن۔" بختو ٹھنڈی سانس بھر کر دھیرے دھیرے کہنے لگی۔

"ہاں" تو تو کنگن لے کر سسرال چلی گئی تھی۔ ادھر پرلے مربعوں والے رانا صاحب مالک سے جھگڑنے آئے تھے، موڑھ میں بیٹھ کر بولے تم کمیوں کی عادت بگاڑ رہے ہو۔ تم پشتینی جاگیردار ہوتے تو ایسا نہ کرتے۔ آج سونا دو گے کل یہ حویلی مانگنے آجائیں گے..... رے کیا کیا بتاؤں..... ۔"

"ارے اماں ہزار دفعہ یہ قصہ سنا چکی ہو۔ اب چھوڑ بھی۔" بختو آہستہ سے بولی۔

"اچھا تو نے یہ نہیں سنا ہو گا تو نے .... ۔ رانا صاحب کی بات مالکن کے کان میں پڑی تو سجدے میں گر کر روتی تھیں اور کہتیں۔" اللہ نے سب کو بنایا کوئی اونچا نہیں کوئی نیچا نہیں۔ کوئی اچھا نہیں کوئی برا نہیں۔" مائی رانی نے اپنے حساب کنگنوں کے سلسلے میں ایک اور انکشاف کیا۔

"چھوڑ اماں اب وہ کنگن ہی کہاں رہ گئے میرے پاس۔ بیچ کھائے اس کے باپ نے۔" بختو نے چپنے ہاتھ ملا کر سنے کی مروڑیاں چھڑاتے ہوئے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کی طرف شکایت آمیز نظروں سے دیکھا جو صحن میں بکھرے ہوئے سوکھے زرد پتے اکٹھے کر رہا تھا۔ اسی سمے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور ننھے کا کرتہ گھٹنوں سے اٹھ کر بادبان کی طرح اس کے جھکے ہوئے سر پر تن گیا۔ اسے اپنے انہماک میں اپنے نچلے دھڑ کی برہنگی کا احساس بھی نہ ہوا مگر بختو دوڑی ننھے کا کرتہ قابو میں کیا اور ان بچوں کی طرف دیکھ جو برآمدے میں تختوں کے چوکے پر بیٹھے تنتے پر ہنس رہے تھے۔

"کچھ کہا چھینک آیا۔" بختو نے زور سے کہا اور جوتے سے اپنے بیٹے کی پیٹھ پر ایک دھپ لگائی۔ اس کے بعد اس کے کرتے کے دونوں دامن ملا کر گرہ لگا دی بختو کو حویلی میں آئے ہوئے بچوں کی وجہ سے جھینپ ہو رہی تھی۔ ورنہ مالکن تو لڑکے ذات کے ننگے

کھلے کی پرو بھی نہ کرتیں۔ مگر ہاں جب وہ اپنی نورانیدہ بچی کو لے کر مالکن کو سلام کرنے آئی تھی تو انہوں نے دو جوڑے سی کر دیے تھے اور کہا تھا "اے بختو بیٹی لڑکی ذات کی شرم تو رکھا کرو۔"

مگر اس ننگے وڑ دھڑکے کے قصے سے بختو کا چچا پریشان نہ تھا اور نہ اس کچھے کی اسے پروا تھی جو اس نے بچی پہنا بھی نہ تھا۔ وہ تو سوکھے زرد پتوں کی تازہ بوچھاڑ سے پریشان تھا جو ہوا کے رخ پر آنگن میں لوٹتے پوٹتے حویلی کے بڑے برآمدے کا رخ کر رہے تھے۔ اور ساری محنت چوپٹ ہو چکی اس گھر میں کام کرنے والے سبھی لوگ جانتے تھے کہ جہاں مالکن کو آنگن میں لگے دونوں درختوں سے محبت ہے وہیں سوکھے پتوں سے حد بھر نفرت ہے۔

دھر جمیل کے اعصاب آگ میں گرے خشک پتے کی طرح چرمرا رہے تھے۔ کیونکہ وہ بھی تک دادا کے کمرے میں نہ پہنچ سکے تھے۔ وہ دروازہ اندر سے بند تھا اس لیے اپنی بڑی چچی کے حکم پر انہیں لے ہوئے کمرے میں خاندان کی بیبیوں کے سامنے بیٹھنا پڑ رہا تھا۔

"اے جمیل بیٹے تم آ ہی گئے۔ آخر ڈاکٹر پر اپنے خاندان والوں کا بھی فرض ہوتا ہے۔" بڑی چچی نے جیسے وہ تار یاد دلایا جو انہوں نے اپنے میاں کی بیماری پر راولپنڈی سے بھیجا تھا۔ .. اور جس کے جواب میں جمیل صرف ٹیلیفون پر اپنے بڑے چچا کا حال احوال پوچھ کر رہ گئے تھے۔ .. . جمیل کا جی چاہا اٹھ کر باہر ٹہلنے لگیں جب تک دادا کے کمرے کا دروازہ کھلے۔ مگر بڑی چچی یہاں صرف جمیل کو طعنہ دینے تو آئی نہ تھیں۔ ان کی بیٹی ابھی زچہ خانے میں تھی مگر وہ اپنے بے ضرری ساس اور انصاف پسند سسر کے پاس اس موقع پر جیسے کھنچی چلی آئی تھیں۔ "اللہ میاں جمیل کے ہاتھوں ان کے دادا کو شفا دے گا۔" بڑی چچی نے مہندی سے رنگے بالوں پر دوپٹہ جماتے ہوئے کہا۔

"موت تو برحق ہے بھابی۔ ہاں انسان اپنی سی کوشش کرتا ہے۔" بڑی پھوپھی نے اپنا سفید بالوں والا سر جھکا کر لمبی سانس لی۔

"اور پھر دیکھیے باجان تو گھنٹوں اسی آنگن میں اماں جان کے ساتھ WALK کرتے نہ تھکتے تھے اس عمر میں اور اب جیسے سارا دھڑ بے کار ہو گیا۔ " جمیل کی چھوٹی پھوپھی جو جمیل کی ہم عمر تھیں اس المیے پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔..... وہ ایک دور دراز کے ضلع کے گرلز اسکول کی ہیڈ ماسٹریس تھیں اور انسپکٹریس کے دورے کی خبر گرم تھی مگر وہ اپنے فرشتے جیسی اماں جان کو آنے والے صدمے میں تنہا کیسے چھوڑ سکتی تھیں۔

"ارے چھوٹی پھوپھی۔ آپ تو پڑھی لکھی ہیں جی کو سنبھالیے۔" جمیل کی بیوی نے چھوٹی پھوپھی کو گلے لگا لیا۔ مگر چھوٹی پھوپھی

اس ہمدردی پر اور بھی آنسو بہانے لگیں۔

"ہائے میری ماں کا کیا ہو گا۔ وہ ابا کے بغیر کیسے جئیں گی اکیلی۔" وہ دھیرے دھیرے فریاد کرنے لگیں۔

"ہاں آ۔ ساری زندگی ہم نے تو یہی دیکھا کہ ہماری اماں جان نے اس گھر میں داخل ہونے کے بعد باہر قدم نہ نکالا۔ خاندان میں کسی کے بیاہ کا موقع آتا تو اپنے ہاتھ سے لکھ بھیجتیں۔ جی چاہے تو اس حویلی میں برات اتار دو۔ یا یہاں سے بارات لے جاؤ۔ تمہیں اختیار ہے۔ اب میں کہاں گھر سے نکلوں کسی کے گھر رنگی ہونے والی ہوتی تو لکھتیں۔ آنا چاہو تو یہیں آ جاؤ۔ تمہیں کوئی فکر نہ کرنا پڑے گی... اب بھی جس کا جیسا جی چاہے کرے۔ نہ کبھی کسی سے کوئی گلہ نہ شکوہ...." جمیل کی بڑی پھوپھی بولیں۔

"مگر سب کا حق بھی تو پہنچا دیتی ہیں۔ یہیں بیٹھے بیٹھے۔ شادیوں پر اپنے ہاتھ سے سیئے ٹانکے جوڑے۔ پیدائش پر ننھے ننھے کرتے ٹوپیاں۔" جمیل کی چھوٹی چچی نے یاد دلایا۔

"ارے دنیا کہتی ہے ساس سسر جان پر سوار رہتے ہیں۔ بھئی ہمارے ساس سسر تو ہمارے گھر میں جھانکا بھی نہیں اور جو ہم یہاں کبھی آئے تو ہمیں مہمان بنا کر بٹھا دیا جاتا۔ اللہ صحت دے میرے سسر کو ہم نے جانے لگتے تو چاول گندم کی بوریاں ساتھ کر دیتے .. ہم سے تو کبھی کچھ مانگا ہی نہیں حالانکہ ماں باپ کا اپنے بیٹوں پر بڑا حق ہوتا ہے۔" جمیل کی بڑی چچی نے یوں کہا جیسے اپنے گناہوں کی تلافی کر رہی ہوں۔

"میں نے کئی بار کہا اماں جان لاہور چلیئے۔ اتنا بڑا شہر ہے۔ اتنا خوبصورت روشنیوں سے جگمگاتا۔ دیکھ کر حیران رہ جائیں گی آپ . . تو ہنس کر یہی کہتیں۔ ہاں بڑا اچھا ہو گا۔ اپنا اور میرا رنگ روپ دیکھو۔ نہ بابا میں تو یہاں کی کھلی ہوا سے نہ جاؤں گی۔" بڑی پھوپھی نے بولنا شروع کیا تو چھوٹی پھوپھی دوپٹے سے آنکھیں اور ناک پونچھتے ہوئے بول پڑیں . . . ور میں ضد کرتی کہ چل کر میرا اسکول دیکھئے کیسی بادشاہت کرتی ہوں۔ تو ہمیشہ جواب ملتا۔ اللہ مبارک کرے۔ تمہارے ابا کو کس پر چھوڑ کر جاؤں۔ اور جب ابا جان کو ساتھ لے چلنے کی بات ہوتی تو کہہ دیتیں یہاں کا خیال کون کرے گا؟ ایک دفعہ میں نے بگڑ کر کہا تھا۔ آپ دونوں تو سارس کا جوڑا ہیں اس پر اماں خوب ہنسی تھیں... اور اب.... چھوٹی پھوپھی اپنی دکھی ماں کی ہنسی یاد کر کے پھر سسکیاں بھرنے لگیں۔ کیونکہ سارس کے جوڑے کی کہانی کسے نہیں معلوم کہتے ہیں۔ ایک مر جائے تو دوسرا بھی بے کھائے پیئے یوں ہی کھڑے کھڑے مر جاتا ہے۔

جمیل کے اندر بیزاری کا جوار بھاٹا ابھی کھول رہا تھا۔ وہ اپنے دادا دادی کی محبت کا احترام کرتے تھے۔ انہیں تو ہمیشہ سے یہ بات

معلوم تھی کہ وہ دادی تو اپنے بچوں کے رشتے ناطوں کے لیے بھی گاؤں سے نہیں نکلے۔ بیٹے تعلیم کے لیے باہر نکلے۔ نوکریاں کیں اور وہیں مستقل ملاقاتوں میں رشتے ناطے طے ہو گئے۔ اس کے بعد بیٹیاں اپنی بھابیوں کے ذریعے بیاہی گئیں اب وہ ان داستانوں کو سننے تو تی دور سے یہاں نہیں آئے تھے۔ وہ ڈاکٹر تھے اور وقت تو جلد سے جلد مریض کو دیکھنا چاہتے تھے دوران کی نظریں دادا والے کمرے کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔

پھر وہ پراسرار دروازہ کھٹ سے کھل گیا اور جمیل اپنا بیگ اٹھائے تیزی سے اس کمرے میں چلے گئے۔

سب بہوؤں اور بیٹیوں نے دیکھا کہ حویلی کی مالکن ہاتھ میں بیڈ پین (BAD PAN) لیے نکلیں اور دور کرنے میں بنی ہوئی دیوار کی اوٹ میں چلی گئیں۔ کسی کی جرأت نہ تھی کہ ان کے ہاتھ سے برتن لے لیتا کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ شوہر کی خدمت میں وہ کسی کو شریک ہونے دیں گی۔ ان کا نیلا دوپٹہ سفید کرتہ اور گلابی پاجامہ ہوا کے تیز جھونکوں میں پیچھے کی طرف اڑ رہا تھا۔

اگر جمیل کی بیٹی نعیمہ سلطان عرف نوی انہیں یوں ہوا کے مقابل جاتے دیکھتی تو شاید اب سے پانچ سال پہلے کی طرح چلا اٹھتی۔ ''آپ پری ہیں'' ''آپ پری ہیں۔'' مگر وہ بے چاری تو اس وقت چھوٹے کمرے میں سارے کنبے کے بچوں کو بہلائے رکھنے کی ڈیوٹی انجام دے رہی تھی۔ در حقیقت خود کو بہلا رہی تھی۔ اس نے بچوں کو کھلونوں میں سے اٹھا کر دوستی کی دوربین اپنی آنکھ سے لگا رکھی تھی جس کے اندر شیشے کے چند معمولی ٹکڑے ہوتے ہیں مگر جو دیکھنے والے کی نظروں کے سامنے رنگوں کی بڑی خوبصورت ترتیب پیش کرتے ہیں جو ذرا سی حرکت سے بدلتی جاتی ہے۔ اب سے پانچ سال پہلے وہ یہاں اپنے ڈیڈی اور ممی کے ساتھ آئی تھی تو آٹھ سال کی تھی۔

ڈیڈی مزید تعلیم کے لیے لندن جانے والے تھے۔ اچانک چھوٹے دادا کا خط آیا کہ جانے سے پہلے حویلی ضرور جاؤ اور خاندان کی سب سے بزرگ ہستیوں کی دعائیں لے کر سمندر پار کا ارادہ کرو..... اس زمانے میں نوی کے ڈیڈی کے پاس ممی کے جہیز والی کار تھی اور وہ اب اتنی قابل اعتبار نہ تھی کہ اس پر لمبا سفر کیا جاتا۔ اس لیے ریل، بس اور پھر تانگے کا سفر کر کے وہ حویلی تک پہنچے تھے۔ اس کی ممی سے چاری، تانگے کے برقعے میں بولائی جا رہی تھیں۔ اور ڈیڈی کبھی ہنستے اور کبھی جھنجھلاتے۔ اس کے ذہن میں یہ سب دھندلا سی گئی تھیں۔ مگر وہ اس حویلی میں رہنے والی اپنی پردادی کو کبھی نہ بھول سکی۔ اسے یاد تھا پہلے تو انہوں نے نوی کو خوب چوما تھا اور پھر فراک میں اس کی ننگی ٹانگیں دیکھ کر جھٹ اپنی بچی سنبھال کر بیٹھ گئی تھیں۔ نوی کے دیکھتے دیکھتے چھوٹی سی شلوار اور ننھا سا دوپٹہ تیار ہو گیا۔ یہ کپڑے پہن کر وہ کس قدر خوش ہوئی تھی اور اپنی پردادی سے چمٹ کر رہ گئی تھی۔ جواب میں وہ انہیں خوش کرنا چاہتی تھی اور کچھ

میں نہیں آتا تھا کہ کیسے خوش کرے۔ اس کے پاس ایک چھوٹا ٹرانزسٹر تھا۔ مگر ڈیڈی نے راستے میں ہی سختی سے منع کیا تھا کہ حویلی میں اسے ہاتھ نہ لگائے کہیں گانا دادا نے سن لیا تو دادا دادی سخت ناراض ہوں گے۔ یہ سن کر نوی نے اپنے ڈیڈی پر سوالات کی بوچھاڑ کردی تھی۔

"کیا وہ فلم بھی نہیں دیکھتے؟"

"نہیں۔"

"کیا ٹی وی بھی نہیں؟"

"نہیں۔"

"اوہ۔ پھر وہ کیا کرتے ہیں ڈیڈی۔ بور ہوتے ہوں گے نا؟"

تب ڈیڈی نے اسے ایک دم ڈانٹ دیا تھا اور کہا تھا کہ خبروں کے وقت وہ خود ٹرانزسٹر "آن" کریں گے مگر نوی تو ننھی منی پیاری سی پردادی کو خوش کرنا چاہتی تھی "سرپرائز" دینا چاہتی تھی۔ ڈیڈی باہر اپنے دادا کے پاس تھے اور ممی سفر کی تکان اتارنے کو سو رہی تھیں۔ نوی نے ممی کے سوٹ کیس سے اپنا ٹرانزسٹر نکال لیا۔ اور گاؤ تکیے کے پیچھے چھپا کر مدھم سی آواز میں لگا دیا تھا۔ پھر خود پردادی کی گود میں سر رکھ کر انہیں دیکھنے لگی.... اور پھر اس نے تعجب سے دیکھا۔ راگ نے ان کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دی۔ ان کے ہاتھ میں چھالیہ اور سروتہ جوں کے توں رہ گئے۔ اور پھر چند لمحے بعد وہ بولا کر تیزی سے آنگن میں نکل آئی تھیں۔

"سنو بیٹا۔ کہیں ریکارڈ باجہ بج رہا ہے" انہوں نے جیسے خواب میں کہا اور آسمان پر درخت کی پھنگوں پر اس بے حد مدھم سے میں بجائے جانے والے باجے کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ تب نوی نے کھلکھلا کر وہ باجہ گاؤ تکیے کے پیچھے سے نکال کر ننھی پردادی کو دکھا دیا تھا اور ان کی بڑی بڑی بادامی آنکھیں ایک دم خوف سے اور بڑی ہو گئیں۔ "بیٹا اس شیطانی چرخے کو چھپا دو... اسے حویلی میں کیوں لائیں؟ تمہارے دادا کو معلوم ہوا تو ناراض ہوں گے۔"

اور نوی کو اپنے پردادا ایک دم برے لگنے لگے تھے۔ اسے تو بس اپنی پردادی لندن میں بھی یاد آتی رہیں۔ اور اب وہ دوسری بار یہاں اپنے پردادا کی بیماری کی خبر پا کر آئی تھی۔ اس اولڈ فیشن جوڑے کی عجیب و غریب محبت کے سلسلے میں سب لوگ کتنی باتیں کر رہے تھے مگر نوی کو صرف اپنی پردادی کو دوبارہ دیکھنے کی خواہش تھی جو ابھی تک پوری نہ ہوئی تھی۔

جب نوی چھوٹے کمرے سے بچوں کے غول میں نکلی تو تختوں کے چوکے پر زرد رنگ کا چھپا ہوا دسترخوان پھیلا ہوا تھا اور ننھی رانی

چٹنی کی گہری گہری پیالیاں، پلیٹیں رکھ رہی تھی۔ ۔ باورچی خانے سے مرغی کے قورمے کی خوشبو آ رہی تھی اور چیٹے پر چمچ بار بار بج اٹھتا تھا۔ بچے خالی پلیٹوں کے گرد جمع ہو گئے مگر مائی رانی کھانا لانے کی بجائے رک رک کر ڈر ڈر کر کہہ رہی تھی۔

آج فجر کو میری آنکھ کھلی تو دیکھا ہمیشہ کی طرح، مالک اور مالکن نماز پڑھ رہے ہیں ایک ہی محراب تلے" مائی رانی نے ہاتھ میں پانچ محرابوں والے برآمدے کی درمیانی محراب کی طرف اشارہ کیا۔ سب نے دہل کر اس محراب کی طرف دیکھا" پھر میں ادھر آئی تو کوئی نہ تھا۔ تھوڑی دیر میں مالکن کمرے سے نکلیں اور آج کے کھانے کی تیاری کا حکم دے کر چلی گئیں۔ . . . " مائی رانی ایک دم رونے لگی۔

"میں نے تو عمر بھر دیکھا۔ مالک اور مالکن نے سدا ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ سدا کٹھا اس آنگن میں بیٹھے۔ مگر نماز کی چوکی تو الگ الگ تھی۔ رے میری آنکھیں اندھی ہو جائیں آج فجر کو میں نے یہ کیا دیکھا رے میری مالکن کیسے جئے گی، مالک کے بغیر ... " اور پھر مائی رانی نے بیبیوں کے چہروں پر غم کے گہرے بادل دیکھ کر اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا اور یہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

"رے میری تو مت ماری گئی۔ مردانے میں کھانا گیا نہیں اور یہاں دسترخوان بچھا دیا .... مالکن کو پتہ چلا تو کیا کہیں گی۔"

بیبیوں نے بڑے خوف سے برآمدے کی اس درمیانی محراب کو دیکھا جہاں آج فجر کے وقت مائی رانی کی آنکھوں نے مالک اور مالکن کو کٹھے نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ اکٹھے نماز پڑھنے کے پیچھے کیا اشارہ ہے اسے سمجھنے کی کوشش ہونے لگی اور چھوٹی پھوپھی نے تو بس رونا شروع کر دیا۔

نوری اس سارے مسئلے سے بور ہو کر آنگن میں نکل آئی۔ اس نے آنگن میں لگے ہوئے ان دونوں اونچے اونچے درختوں کو چھوا جن کی لمبی لمبی شاخیں نیچے کچے ہتوں کو جھلک رہی تھیں اور جن میں سے ایک پر آج بھی جھولا پڑا ہوا تھا اس جھولے پر شاید اس حویلی سے تعلق رکھنے والے ہر شخص نے بچپن میں پینگیں بڑھائی ہوں گی۔ نوری جب اس سے پہلے یہاں آئی تھی تو اس جھولے پر بیٹھی تھی مگر اسکول میں جھولے سے گرنے کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے جھولے سے ڈر گئی تھی۔ اس لیے چپ چاپ بیٹھی رہی۔ دوپہر کو اس سناٹے میں پردادی نے نوری سے بڑی رسانیت سے پوچھا تھا۔ ... ارے بیٹا پینگ نہیں بڑھاتیں؟"

"نہیں۔ " نوری اپنے خوف کا اظہار ان پر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"تو میں تمہیں سکھا دوں۔" تب وہ جھولے میں بیٹھ گئی تھیں۔ انہوں نے اتنے لمبے لمبے پینگ بڑھائے کہ ان کا نیم دوپٹہ سفید

کرتہ اور گلابی پاجامہ ہوا میں پرندوں کے پروں کی طرح پھیلنے اور سمٹنے لگا۔ ان کی بڑی بڑی بادامی آنکھیں چمک رہی تھیں، گلابی رنگ پر سرخی کی چھوٹ تھی اور بے دانتوں کا منہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔

"پردادی آپ پری ہیں۔ آپ سچ مچ پری ہیں۔ میں آپ کو پری کی تصویر دکھاؤں۔ میری کتاب میں ہے" نوی خوشی سے چلانے لگی تو انہوں نے زمین پر پاؤں رگڑ کر جھولا ایک دم روک لیا تھا اور کہا تھا۔ "بیٹا کسی سے کہنا مت کہ بڑی دادی جھولا جھول رہی تھیں۔"

اس بات کو پانچ سال گزر گئے۔ یہ راز نوی کے دل میں تھا۔

درخت پر سے چند سوکھے پتے ٹوٹ کر نوی کے اردگرد پھیل گئے مگر نوی کے ذہن میں تو پانچ سال پہلے والی پردادی کی باتیں نرم نرم کونپلوں کی طرح پھوٹی پڑ رہی تھیں . اسے حویلی میں آئے گھنٹہ بھر ہوا تھا اور وہ اب تک اپنی پریوں جیسی پردادی کو دیکھ بھی نہ سکی تھی وہ جھولے پر بیٹھ گئی اور بچوں والی دوربین سے بھی بہلانے لگی .... پھر اس نے دیکھا، مائی رانی برآمدے کی اسی پرسرار محراب سے گزر کر کھانے کا تھال اندر کمرے کی طرف لے جا رہی ہے جس کے آگے آج فجر کو پردادا اور پردادی نے اکٹھے نماز پڑھی تھی۔ جب کہ دادا آٹھ دن سے بستر سے اٹھ بھی نہیں سکے تھے۔ ..... پھر نوی نے دیکھا اس کے ڈیڈی اپنا ہینگ سا ٹائے اسی محراب سے گزر کر ڈیوڑھی کی طرف جا رہے ہیں۔ ان کا سر جھکا ہوا ہے اور خاندان کی ساری عورتیں منہ لٹکائے دسترخوان کے گرد جمع ہیں۔

"نوی تم یہاں ہو؟ کھانے پر چلو۔ پھر جانے کب کھانا ملے گا۔ تمہارے پردادا کی حالت خراب ہے" ممی اپنے بغیر آستینوں کے بلاؤز کو ساری سے خوب اچھی طرح چھپا کر مڑ کے اس کے پاس آ گئیں۔

"وہ ہوو میں نہیں کھاؤں گی وہاں" نوی نے دھیرے سے کہا۔

"کیوں نہیں کھاؤ گی۔ بعد میں بھوکی مرو گی۔" ممی نے اس کا بازو پکڑا۔

"نہیں ممی۔ میں باورچی خانے میں بیٹھ کر کھا لوں گی۔ مجھے سب کے ساتھ کھاتے شرم آتی ہے۔" نوی نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا تو جاؤ بختو سے کھانا لے لو۔" اور ممی کھانے پر چلی گئیں۔

نوی نے فرمانبردار بچوں کی طرح اٹھ کر باورچی خانے میں جھانکا۔ وہاں اس وقت کوئی نہ تھا۔ اور پھر وہ ایک دم اس کمرے کی طرف دبے پاؤں چلی گئی جس میں اس کی پریوں جیسی دادی ابھی تک چھپی ہوئی تھیں۔ اس نے آہستہ سے دروازے کا پٹ کھولا اور

اندر چلی گئی۔

دھوپ سے آ کر اندھیرے کمرے میں کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ پھر اس نے پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھا تو اسے مونڈھے پر بیٹھی ہوئی پردادی کی تنی ہوئی پشت نظر آئی۔ ان کا نازک سفید ہاتھ پردادا کے کالے دھبے پر رکھا اور زیادہ سفید نظر آ رہا تھا۔ پردادی گنگنا کر سورۂ یٰسین کی تلاوت کر رہی تھیں۔ پردادا اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہے تھے اور ان کی آنکھیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔

نوی دبے پاؤں اور آگے بڑھ گئی مگر کسی کو کمرے میں اس کی موجودگی کا احساس نہ ہوا۔ پردادا کے ہونٹ حرکت کر رہے تھے۔ وہ ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ "میرے کفن کا کیا ہوگا؟... میرے کفن کا .....؟"

"ارے تم بار بار بھول جاتے ہو...... بار بار بتاتی ہوں..... کفن تو ہم دونوں کے آبِ زمزم میں دھلے موجود ہیں ..... سنا تم نے؟ آبِ زمزم میں دھلے کفن رکھے ہیں ..... اطمینان رکھو ..... سنا تم نے" پردادی نے ان کے کان کے پاس جھک کر زور سے کہا۔ ان کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔

پھر نوی نے دیکھا پردادا کی آنکھیں ایک دم زیادہ پھیل گئیں۔ انہوں نے نفی کے لیے اپنا سر تکیے پر مسلسل ہلانا شروع کر دیا۔

"تم اطمینان رکھو...... سنا تم نے..." پردادی نے پھر اطمینان دلایا اور وہ رونے لگیں۔

نوی کا جی چاہا کہ وہ ان سے لپٹ جائے مگر پردادا ویسے ہی ٹوٹے ٹوٹے لفظوں میں بول رہے تھے۔ "تم نے سب کچھ تو دیا مجھے۔ یہ حویلی۔ زمین۔ یہ ....."

"میں بھی تمہاری تھی..... یہ بھی تو گنو..." پردادی نے ایک دم پرسکون آواز میں ان کے کان کے قریب جھک کر کہا۔

"میں نے تمہارے لیے اپنا سب کچھ چھوڑ دیا...... دنیا سے منہ چھپا کر رہا اپنے ماں باپ، بھائی بہن..... سب چھوڑ دیئے۔" دادا کی لال لال زبان ہونٹوں پر عجیب انداز سے حرکت کر رہی تھی۔

"میں نے تمہارے لیے دنیا چھوڑی..... دولت... شہرت... کہو کہو کیا تمہارے دل میں ہے ...... بولو......" پردادی کی سسکیوں میں ٹوٹتی آواز نوی بڑی حیرانی سے سن رہی تھی۔

اب انہوں نے پردادا کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ ان کی تھرتھراتی کلائیوں میں شیشے کی چوڑیاں آپ ہی آپ کھنک رہی تھیں۔

"میرا کفن جہیز سے منگوانا۔ اپنے پیسے سے خریدا مجھے نہ دینا میری عاقبت خراب نہ ہو میں پارہ پارہ ..... جاؤں

. . آن "پردادا" آنکھیں بند کر کے اسی انداز سے بڑبڑا رہے تھے۔

اور گھبرائی ہوئی لوئی کے ہاتھ سے بچوں والی دوربین چھوٹ کر اس زور سے زمین پر گری کہ اس کے اندر قید رنگا رنگ چوڑیوں کے ٹکڑے بکھر گئے مگر نہ پردادا چونکے نہ پردادی۔

لوئی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور جو بات سمجھ میں آئی وہ اتنی تھی کہ اس کی پریوں جیسی پردادی چکرا کر زمین پر خشک پتے کی طرح گر گئیں۔ . . . اس کے بعد چیخیں مارتی ہوئی لوئی اپنی پردادی سے لپٹ گئی۔

سب آئے تو لوئی کے پردادا نیند کے انجکشن کی وجہ سے غافل سو رہے تھے اور لوئی کی پردادی مر چکی تھیں۔

◆◆◆

منی میلے میں

مشعل کا تڑپتا ہوا شعلہ۔ اس پر ڈھول اور ہارمونیم کی آواز . وسیع و عریض احاطے کے درختوں پر بسیرا لینے والے کوے شاخوں میں بھڑک کر پھڑپھڑانے لگے۔

چھم چھم. اس نے موہ بھر کو گھنگھرو بجائے اور پھریوں گایا۔

ہٹ جا بے دردی گنوار وا میں تورے سنگ نہ جیہاری۔

بول ختم ہوتے ہی ہر چیز جیسے تیز ہو گئی۔ ڈھولکیا اپنے سر کو جھٹک جھٹک کر اچھل اچھل کر ڈھول پیٹنے لگا۔ ہارمونیم والا چابک پر دوڑتی ہوئی انگلیوں کے ساتھ گردن اور آنکھیں نچانے لگا اور مشعلچی بے چارے کی تو شامت آ گئی. . . . بول گا کر وہ یوں گلی کی طرح لوگوں کے دائرے کے اندر چھم چھم کرتی تڑپتی پھری کہ مشعلچی کو اس کا چہرہ روشن رکھنے میں خاصی محنت کرنا پڑی...... اس پر سے بے چارے کو یہ بھی خیال رکھنا تھا کہ کہیں ناچتا ہوا شعلہ ناچنے والی کو جلا نہ دے۔ پھر یہ کم بخت مشعل کیا تھی' اچھی خاصی مصیبت۔ مٹی کے تیل کی بوتل پر خوب بہت سی مٹی تھپی ہوئی تھی۔ جب مٹی میں آیا ہوا تیل جل جاتا اور شعلہ مدھم پڑتا تو وہ بوتل جھکا کر مٹی کو دوبارہ تیل سے تر کر لیتا۔

منی بی بی' کمال کی گود میں دبکی اس ناچتے تھرکتے شعلے اور ناچتی تھرکتی عورت کو جیسے غنودگی میں دیکھ رہی تھی. وہ تقریباً سو گئی تھی کہ اچانک کمال اسے گود میں اٹھا کر یہ تماشا دکھانے لے آیا تھا۔

منی بی بی کو گہری اندھیری رات میں یہ تھرکتی عورت اور تھرکتی روشنی بڑی اچھی لگ رہی تھی مگر منی بی بی کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی دوسرے بہت سے بچوں اور احاطے کے نوکروں کی طرح دائرے میں اکڑوں بیٹھ کر یہ تماشہ دیکھے۔ دوسروں کی طرح وہ بھی ہاتھ بڑھا کر اس کی بھنوری کی طرح چکراتی پیشواز کو چھونے کی کوشش کرے' سپرنٹنڈنٹ صاحب کے نوکر مہاراج موٹے کی طرح وہ بھی پیشواز کی چھتری تلے بیٹھنے کی کوشش کرے...... مگر منی بی بی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کوشش ناکام ہی ہو گی کیونکہ وہ "ہٹ جا بے دردی گنوار وا" کہتی چکر تی' چھم چھم کرتی دور چلی جاتی۔ وہ اسی تیزی سے کہ مشعلچی کو دوڑ کر اسے روشنی میں لانا پڑتا۔ اور پھر وہ ہر بار نئے سرے سے جھومنے لگتی۔ اس کے سر اور سینے پر پڑے ہوئے گہرے اودے دوپٹے کا گوٹا اور ستارے' ہری پیشواز کا بھنور جیسا گھیر اور سرخ رنگ کا پاجامہ جیسے بھڑک اٹھتے۔ وہ روشنی میں آتے ہی گردن مٹکاتی تو اس کی چاندی کے جھمکے اور چاندی کا جھومر اور سونے

کا بدن جیسے چینک رہے۔ ڈھیلی ڈھالی آستینوں میں ڈھکے ہوئے ہاتھ "بے دردی" کو ہٹانے جھٹے تو چاندی کے گھنگھروؤں والی چوڑیاں جھم سے کود کر آستینوں میں چھپ جاتیں۔

منی بی بی کمال کے دیئے ہوئے پیسے اس عورت کی طرف بڑھا بڑھا کر تھک گئی وہ ہر بار پیسہ لینے لپکتی 'منی بی بی کی بدیکھتی اور بے دردی کے سنگ نہ جانے کا جوڑ پیش کرتی

میں تورے سنگ جیا تو جوگن مرجیو

مورے پی ہر کی جلیباں میں تورے سنگ نہ جیہوری

اور منی بی بی کو غنودگی میں یہ سارا تماشا اتنا اچھا لگا کہ وہ اچانک بڑی فراخ دل ہوگئی۔ اسے اپنی بہنوں پر رحم آنے لگا جو پاس کھڑی کمال کو نوچ نوچ کر اپنے ہاتھ سے ناچنے والی کو پیسہ دینے کی ضد کر رہی تھیں۔ اس نے اپنے ہاتھ میں آیا ہوا پیسہ اپنی ایک بہن کو دے دیا تاکہ اس کی حسرت بھی پوری ہو جائے۔ پھر وہ رات کے اندھیرے میں چپ چاپ کھڑے ہوئے درختوں کو دیکھنے لگی جن پر مدھم سی روشنی پڑ رہی تھی۔ اس نے ماں پی کی بتائی ہوئی بھتنیوں کو دیکھنا چاہا مگر اسے خلاف معمول آج درختوں پر کچھ نظر نہ آیا۔ ہاں بس مشعل کی تھرکتی ہوئی روشنی میں یہ درخت اور بھی اونچے نظر آئے۔ اتنے اونچے جیسے ان کی پھنگیں آسمان میں پیوست ہو گئی ہوں۔

پھر اس نے کمال کے کندھے پر سر ڈال دیا' اور کمال اور مہاراج کی تیز تیز باتیں سنیں لیکن گہری نیند نے اسے کچھ سمجھنے کی مہلت نہ دی۔

مگر جب ماں میاں دوسرے دن شہر سے لوٹے تو مہاراج موٹے نے پہلے ہی ان سے کمال کی شکایت جڑ دی۔ اور ابا میاں گھر میں گھستے ہی کمال پر خوب برسے۔ کمال نوکر ہوتے ہوئے بھی نوکر نہ تھا۔ وہ تو منی بی بی کے گھر بچپن سے پلا تھا ورنہ سرکاری تنخواہ پانے کے باوجود ابا میاں سے بہت ڈرتا تھا۔

"اب ہماری عدم موجودگی میں طائفے بلاتا ہے اور گھر کی بیٹیوں اور بچیوں کو یہ تماشے دکھاتا ہے؟ کم از کم دو روپے پر تو وہ آئی ہو گی...... کم بخت یوں حرام میں اپنے پیسے اڑاتا ہے؟" ابا میاں کمال کا کان پکڑے چلاتے رہے۔

امی نے ماکھ لاکھ ابا میاں کو یقین دلایا کہ انہوں نے یا خاندان کی کسی بھی بیگم نے ناچ نہیں دیکھا۔ بس دروازے کی درز سے ایک نظر ڈالی تھی۔ کسی کو اچھا ہی نہ لگا' ہم سب تو بیٹھ کر باتیں کرتے رہے تھے۔ اس کے باوجود کمال کے تھپڑ پڑے۔ لیکن کمال

بھی کہہ گیا کہ اس نے تو یہ طائفہ بلایا ہی نہیں تھا۔ مہاراج نے بلایا ہوگا۔ اب نام اس کا لگ رہا ہے کیونکہ رات دونوں کا جھگڑا ہوگیا تھا۔

منی بی بی صبح کی اس صورت حال سے سخت چکرا گئیں۔ ادھر کمال سے ہمدردی کے مارے انہیں رونا آیا جاتا تھا۔

آخر ابا میاں نے بطور سزا کمال پر چوہیں گھنٹے کا کرفیو لگا دیا۔ انہوں نے کہا جب تک اس کم بخت کی شادی نہ ہو جائے یہ اسپتال سے سیدھا ڈیوڑھی میں آئے گا اور کہیں باہر نہیں جائے گا۔

منی بی بی کمال کا تمتمایا منہ دیکھ نہ سکی اس لیے باہر نکل گئی باہر اس کی بہنیں اور دوسرے گھروں کے بچے جمع تھے اس سب نے مل کر منی بی بی کو بتایا کہ رات کو جس جس نے ناچنے والی کو اپنے ہاتھ سے پیسے دیئے وہ سب پیسے اللہ میاں کے گھر آگ میں تپا کر اس کے جسم پر چپکائے جائیں گے۔

"بھئی ہم نے تو ایک ہی پیسہ دیا تھا.... اللہ توبہ اللہ توبہ......" منی بی بی کی بہن نے ذرا اطمینان سے حساب جوڑا۔ مگر سب سے زیادہ پریشان منی بی بی ہوئی۔

اس کے دل سے کمال کے پٹنے کا رنج' کمال کے خلاف غم و غصے میں تبدیل ہو گیا" بڑے چالاک! خود تو اللہ میاں کے گھر جلیں گے نہیں' ہمیں جلوانے کا انتظام کر دیا" پھر اسے اپنی بیوقوفی پر اتنا پچھتاوا ہوا جس کی حد نہیں۔ لکھنوی پھوپھی اسے پہلے ہی بتا چکی تھیں کہ گانا' ناچنا' کودنا گناہ ہوتا ہے۔ بچوں کو چاہیے کہ چپکے سے بیٹھ کر پڑھیں یا اچھے اچھے کھیل کھیلیں۔

ذرا دیر بعد منی بی بی ہنسی اسی کا میلا ڈوپٹہ گھسیٹتی کمال کی کوٹھری میں پہنچی۔

"ہمیں نماز پڑھو دو کمال" وہ منہ پھیر کر کمال سے گویا مجبوراً مخاطب ہوئی۔

"کیوں .... یہ کوئی وقت ہے۔" کمال پلنگ پر لیٹے لیٹے غرایا۔

"سب کہتے ہیں گناہ ہو گیا ہے اللہ میاں کے ہاں۔" منی بی بی کا گلا بھر آیا۔

"کیسا گناہ؟" کمال پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"پیسے جو دلوائے تھے تو نے اس عورت کو" اور منی بی بی ایک دم رونے لگی۔

"اچھا توبہ توبہ اب نہیں دوں گا پیسے.." کمال نے ہنس کر اسے اپنے قریب گھسیٹ لیا۔

"ہمیں اللہ میاں کے گھر جلایا جائے گا؟" منی بی بی نے سسکتے ہوئے پوچھا۔

"منہ منہ میری بیٹا کو اللہ میاں تھوڑی جلا ئیں گے منی کیوں کا مجھے جلا دیجئے بس۔"

اور منی بی بی نے آنسو پونچھ لیے ''کیونکہ اسے معلوم تھا کہ کمال دکھ جھوٹا سہی مگر وہ منی بی بی سے کئے ہوئے وعدے ضرور پورے کرتا ہے۔

جب بدلتے موسم میں منی بی بی بیمار ہو گئی۔ ڈیڑھ ہفتے کے بخار میں وہ اتنی چڑچڑی اور ضدی ہو گئی کہ کسی تک کا کہنا نہ مانتی۔ بلکہ وہ تو کمال کو دیکھ کر اور زیادہ بگڑ جاتی۔۔۔ ''بس ماہی سے ان دنوں اس کی ذرا ذرا سی رہی۔ وہ ماہی سے پوچھتی کہ اللہ میاں کی شکل کیسی ہے، وہ کہاں رہتے ہیں۔۔۔ '' وہ بچوں کو پیار کرتے ہیں یا نہیں؟ اور ماہی کے پاس تو ہر بات کا جواب موجود تھا ہی ......''

بخار اترنے کے بعد بھی وہ ویسی ہی چڑچڑی بنی رہی۔ سب سے الگ تھلگ وہ اپنی پلنگڑی پر جیسے دھونی رمائے بیٹھی رہتی۔ ہاں ہی قریب سے گزرتیں تو اس کا جی چاہتا کہ وہ اس کے پاس بیٹھی رہیں۔ لیکن ان بے چاری کو اپنے اتنے بہت سے کاموں سے فرصت ہی کہاں تھی۔

''ایک دن کمال ''منی بی بی کی بے رخی کے باوجود اس کے قریب آ بیٹھا۔ ''کل میلہ ہے منی بی بی ''کمال نے چپکے سے اسے بتایا۔

''منی بی بی منہ بنائے، اپنے سوکھے ہاتھ پاؤں سمیٹے بیٹھی رہی۔

''ہم تم کو میلہ دکھا لے چلتے ''مگر'' کمال نے ٹھنڈی آہ بھر کہا کہا اور اپنی بڑی بڑی مونچھیں مروڑنے لگا۔ مگر منی بی بی ویسے ہی بھچوں کی طرح بیٹھی پلکیں جھپکتی رہی۔

''تم بے چاری نے میلہ تو دیکھا نہیں ہوگا۔'' کمال نے جیسے حقارت سے کہا۔

''ہوتہہ، ابامیاں نہیں لے گئے تھے؟'' منی بی بی کو گزشتہ سال کی بات یاد آ گئی۔

''ہونہہ، تانگے پر بیٹھے بیٹھے بھی کہیں میلہ گھوما جاتا ہے؟ ابامیاں نے تجھے تانگے سے اترنے دیا تھا؟'' کمال نے پوچھا۔

''نہیں تو ... اچھے بچے تانگے میں بیٹھ کر میلہ دیکھتے ہیں ابا میاں کہتے تھے . . ''منی بی بی آہستہ آہستہ کمال سے بے تکلف ہونے لگیں۔

''ہائے ہائے'' میلے کے اندر ایسی ایسی مزے کی چیزیں ہوتی ہیں۔ آدھی لومڑی آدھی عورت ہنڈولے سانپ اور نیولے کا تماشا اور جناب کھلونے ہی کھلونے۔'' کمال نے آنکھیں بند کر کے چیزیں گنوانا شروع کیں۔

''ہنڈولے میں تو ہم بیٹھے تھے . ''منی بی بی نے اچانک یاد کیا۔

"اور جناب نٹ کا تماشہ اور چاٹ کی دکانیں، ملائی کی برف اور مرمرے اور چنے کی دال ۔ "

منی بی بی ایک دم پگھل گئی۔ بیماری میں اسے اتنا پرہیز کرایا گیا تھا کہ وہ ندیدی ہو گئی تھی۔

اس موقع پر کمال اور منی بی بی کے درمیان ٹوٹا ہوا رشتہ پھر استوار ہو گیا۔ چپکے سے وعدہ ہوا۔ اور منی بی بی کی بہنوں کو خبر بھی نہ ہوئی کہ وہ جو ہنستی خلا میں گھورتی رہتی ہے، اندر سے اتنی چالاک بھی ہو سکتی ہے۔ منی بی بی کے خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور اس نے اپنی بہنوں کو دیکھا جو بلی اور گڑیا کا بیاہ رچانے میں جُتی ہوئی تھیں...... اور بلی چیتوں کی سہرا جھٹک کر بار بار گھروندے سے بھاگ جاتی تھی۔

اس رات منی بی بی نے خواب ہی خواب دیکھے۔ کھلونوں کی دکانیں ہی دکانیں مٹی کی مورتیاں، کپڑے کی گڑیاں اور سیلولائڈ کے بھوے۔ پھر جناب مٹی کی پوری ننھی سی گرہستی۔ چکی چولہا، ہنڈیاں اور گھڑے، صراحی، بیلن، چمٹا۔ مزے سے گڑیا کو جہیز میں دیا جا سکتا تھا۔ یہ چیزیں کبھی بھی گھر میں لاتی، لیکن امی اس کی صورت دیکھتے ہی جل جاتیں۔ کیونکہ وہ ہر کھلونے کا "نہ مانگتی۔ چاہے وہ سر پر دودھ کا گھڑا اٹھانے والی گجریا ہو، یا پیٹھ پر کپڑوں کی گٹھڑی اٹھانے والی دھوبن، حتیٰ کہ کمر پر مشک لادے بہشتی اور سر پر ٹوپ پہنے صاحب بہادر کی بھی وہی قیمت! اس پر سے عششش کا سہرا آ کا گز الگ مانگتی۔ ابی لینے کو تو یہ مورتیاں لے دیتیں مگر گھنٹوں جلاتیں کہ خواہ مخواہ پیسے کی بربادی ذرا میں ٹوٹ کر مٹی میں مل جائیں گی۔ مگر منی بی بی اپنے حصے کی گجریا لے کر سوچتی کہ بھلا اتنی پیاری گجریا بھی ٹوٹ سکتی ہے۔ لیکن اسے کیا کیا جاتا کہ گجریا پانے کی خوشی میں دوڑتے بھاگتے ہوئے وہ گرتی اور گجریا ایک دن میں ہی کھیل کھیل ہو کر پکے آنگن میں بکھر جاتی۔ اور ساتھ اس کی ساری مسرت بھی ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتی پھر اللہ کرتا کہ بی بساطن آ پہنچے، کنگھے، مسی سرمہ، اٹن اور جانے کن کن الا بلا کے ساتھ دروازے پر پھیرا لگاتیں تو منی بی بی فوراً ہی اسے اندر آنے کی دعوت دے دیتی۔ کیونکہ بی بساطن کی بھین کی صندوقچی میں گڑیاں بھی تو ہوتیں منی بی بی گڑیا کے لیے مچلتی تو امی کہتیں۔ "اے ہے یہ کم بخت، گندی سندی روئی بھری گڑیاں بھی تمہارے کھیلنے کی چیز ہیں؟ تم اپنے بھوے سے کھیلو" مگر منی بی بی کو یہ سیم، ہڈ کے سخت سخت بھوے نہ بھاتے، اسے تو رنگ رنگ کے کپڑوں میں ملبوس، انگل انگل بھر تنک پاروں کی طرح بڑی آنکھوں والی گڑیاں ہی اچھی لگتیں۔ یہ گڑیاں اسے کبھی نہ ملیں، ہاں وعدے ملتے کہ کل وہ اپنی امی سے کپڑے کی گڑیا یاد دلا کر بنوائے۔ لیکن یہ وعدے کبھی پورے نہ ہوتے۔ مگر آج منی بی بی کے خوابوں پر تو نئے فیشن کے جاپانی کھلونوں کا وہ امی کا بس نہ تھا... منی بی بی نے رات بھر سوتے میں اتنی بہت سی کپڑے کی گڑیاں خریدیں کہ اس سے اٹھائے نہ اٹھیں... اور پھر خوابوں میں بامیوں کا رود بھی نہ چلا جراثیم کی پروا کیے بغیر مزے سے وہ پیٹ بھر بھر چاٹ اور ملائی کی برف کھاتی رہی۔ مگر آخر خواب میں ابا کی سواری کا سفید

بھاگ جیسے نفافوں والا تاتمگا آ ہی گیا جس میں اس کی بہنیں فراکیں پہنے غرور سے بیٹھی میلہ دیکھنے چلی آئی تھیں۔ چہکتے ہوئی صبح میں منی بی بی کی آنکھ کھلی تو بڑی مشکل سے اسے یقین آیا کہ وہ خواب دیکھ رہی تھی۔ یہ صبح دسہرے کے میلے کی نہ تھی۔

منی بی بی خوابوں اور تصورات کے بوجھ سے لدی پھندی، بے حد وقار کے ساتھ اپنا پلنگڑی پر اٹھ کر یوں بیٹھ گئی جیسے اس گھر کو جھیلنے برابر بھی اہمیت نہ دیتی ہو۔ بیماری کے بعد سے شروع ہونے والے معمول کے مطابق نہ دھوئی نہ دوئی۔ اس نے باورچی خانے کے سامنے پڑی ہوئی بچھی والی بدصورت میز کے گرد بیٹھی ہوئی اپنی بہنوں کو دیکھا۔ وہ سب کیسی مریضوں کی طرح چینی کے بڑے بڑے پیالوں پر جھکی گرما گرم دودھ اور ڈبل روٹی کے ملغوبے میں چمچے چلا چلا کر پیٹ کا دوزخ بھر رہی تھیں۔ اور انہیں خبر بھی نہ تھی کہ منی بی بی کو اس کم بخت ناشتے کی ذرا برابر بھی پروا نہ تھی آج سے پہلے وہ بھی اپنی بہنوں کے ساتھ ناشتے کی میز پر آتے ہی یہ سوچ کر کڑھا کرتی تھی کہ انہیں روز روز دودھ اور ڈبل روٹی کیوں ملتی ہے۔ ایک امی اور ابا میاں ہیں کہ ان کے لیے ماما بی کشتی میں چائے دان سجا کر یوں لے جاتیں جیسے بچے نظر لگا دیں گے۔ ارے اگر وہ چائے دان کو ٹی کوزی سے بھی اڑھا دیا کرتیں تو بھی بچے زبردستی تو یہ خوشبودار سنہری چائے نہ پی بیتے اور پھر وہ تلے ہوئے انڈے... حلوے اور یخنیاں... ان کے بھائی کو تو ان چیزوں میں حصہ مل جاتا لیکن ان بے چاریوں کی قسمت تو صرف جاڑوں کی بارش میں کھلتی جب ان کے دودھ بھرے پیالوں میں ذرا سا چائے یہ سوچ کر ڈال دی جاتی کہ ذرا گرم ہو جائیں۔ اور انڈے؟ انڈے تو جب سے پھوپھی آئی تھی لڑکیوں کے لیے ممنوع تھے۔ با کو خبر کیے بغیر پھوپھی نے فیصلہ کروا لیا تھا کہ لڑکی ذات کو گرم چیز زیادہ کھلانا مناسب نہیں ورنہ نو دس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے جوان جہتیں ہو جائیں گی... مگر منی بی بی نے ہزار بار انڈا چھو کر دیکھا اسے تو یہ ٹھنڈا ہی لگا... اور پھر انڈے کی اسے پروا بھی کب تھی۔ جب انڈے کھلائے جاتے تو نرے کچے کے کچے فرائی پین سے اتار کر سامنے ڈال دیے جاتے۔ جنہیں کھاتے ہوئے سب بہنوں کو ابکائیاں آتیں۔

ماما بی کشتی سجا کر ابا میاں کے کمرے کی طرف گئیں مگر منی بی بی نے ادھر دیکھا بھی نہیں۔ اسے آج ان حقیر باتوں کی پروا ہی کب تھی۔ وہ بغیر کسی کے کہے پلنگڑی سے اتری لوٹے کے بچے ہوئے پانی کے چند قطروں سے ایک ہی ہاتھ چہرے کا اپنا تھا ناک اور ٹھوڑی چپڑ کر پھر اپنی پلنگڑی پر براجمان ہو گئی۔

"منی بی بی ادھر دکھاؤ پورا منہ دھو دیا آدھا۔" منی بی بی کی سب سے بڑی بہن نے روز کی طرح اس کی چوری پکڑنا چاہی۔ وہ خدا جانے کیوں منی بی بی کو گندہ ثابت کر کے بہت خوش ہوتی۔

"دھویا ... پوچھ بھی لیا۔" منی بی بی نے رکھ رکھاؤ سے جواب دیا۔

''ہٹ گندی۔ ہمیں خوب معلوم ہے تو نے کل بھی نہیں کی ہوگی اور فراک میں منہ پونچھا ہوگا۔'' بڑی بہن نے کہا۔

''اور آ کر یہ کھاؤ نا۔ بیٹھی کیا ہو۔ کیا تمہیں چائے ملے گی؟'' دوسری بہن نے اس کے حصے کے بھرے ہوئے پیالے کی طرف اشارہ کیا۔

منی بی بی کا جی چاہا کہہ دے ''تمہیں کھاؤ'' ہم تو آج ''مگر کمال نے تو اسے منع کیا تھا کہ کسی سے میلے جانے کی بات نہ کرنا ورنہ سب پیچھے لگ جائیں گی۔ اس لیے منی بی بی اٹھی اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر چپ چاپ دودھ پینے لگی۔

اس صورت حال سے مطمئن ہو کر اس کی بہنیں میز پر سے خوش خوش اٹھ گئیں اور پھر ادھر کو پچھلے احاطے میں بھاگ لیں۔ آج ماسٹر صاحب نے چھٹی کی تھی۔ اس لیے وہ اطمینان سے گھنٹوں کھیل سکتی تھی کبھی پرانی بیتوں کا گھر بنتا اور کبھی درختوں کے پتوں سے باغ لگتا۔ روگرد کے ایک پیچھے ایک قطار میں بنے ہوئے چھ گھروں کا یہ مشترک احاطہ تھا سب گھروں کے بچے چھٹی کے دن یہاں آزادی سے کھیل سکتے تھے۔

منی بی بی اپنی بہنوں کو جاتے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ باہر کمال اپنی کوٹھریا میں ان سب کے انتظار میں بیٹھا ہوگا۔ وہ انہیں دیکھتے ہی کہے گا کہ آخری گھر والی بھورانی نے انہیں بلایا ہے اور وہ سب بھورانی کے گھر کی طرف بھاگ جائیں گے۔ جہاں ماولد بھورانی اپنے آنگن میں آنے والے ہر بچے کو کاغذ کے پھول بنا بنا کر دیتیں اور ان کے ہاں سٹھ تو ہمیشہ مٹکے میں بھرے رہتے۔ سونگی کے خوب بڑے بڑے سٹھ۔ بچے گھنٹوں ان کے آنگن سے نہ نکل پاتے۔

اپنی بہنوں کے بے وقوف بننے کے تصور میں وہ ایسا کھوئی کہ پیالے میں دودھ ختم ہو گیا۔ ابا میاں کے تانگے میں سائیس نے گھوڑا جوت دیا ہوگا منی بی بی نے تصور کیا وہ گھوڑے کی ٹاپیں سن رہی تھیں۔ مگر اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابا میاں بھوگنی پور جائیں گے اور وہ چپکے سے کمال کے ساتھ تمام دن میلے میں گھومے گی

پر ہوا یہ کہ ابا میاں امی کو خدا حافظ کہہ کر باہر چلے گئے۔ اور پھر تانگہ گزرنے کی آواز بھی اس نے سن لی۔ پھر منی بی بی نے اطمینان کی سانس لیتے ہی دوسری فکر اپنے سر پر لادلی۔ ... جانے اس کی بہنیں بھورانی کے گھر گئیں بھی یا نہیں؟

پھر کمال خوشی سے کھلا نذر آ گیا ایسا ٹھاٹ کیے ہوا تھا کہ لگتا آج عید ہے۔ خوب گھیری شلوار بوسکی کی قمیض گلے میں سرخ رومال دو سر پہ پیگزوں لمبی پگڑی جسے اس نے بڑے بانکپن سے ایسا پیچ در پیچ باندھا تھا کہ اس کا بایاں کان تک ڈھک گیا تھا۔ امی نے کتاب پر سے سر اٹھا کر دیکھا اور مسکرا دیں۔

دیکھئے باجی اب صاحب گر ماریں بھی تو میرے کان پر جوں نہیں رینگ سکتی۔ "کمال نے اپنے پگڑی کی طرف اشارہ کیا۔

"دیکھو! تو ہے بڑا بے غیرت۔ کہے دیتی ہوں شام سے پہلے آجانا ورنہ پٹو گے۔" امی نے سنجیدہ بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے کیا نہیں جاتا۔ منی بی بی کی وجہ سے میں نے کہا چل جاؤں۔ بے چاری منی بی بی اتنی بیچاری رہی ہیں۔" کمال نے احسان امی کے سر پر رکھ دیا۔

"ہاں تم تو بے چارے بالکل شوقین نہیں۔۔۔ ۔۔۔ خیر جلدی سے لوٹ آنا ۔۔" امی نے کہا۔

اور کمال نے امی کو کوئی جواب دیے بغیر منی بی بی کو لال رنگ کی فراک پہنائی اور پھر ننھا سا چوڑی دار پاجامہ جو عید پر پہنے جانے کے بعد اب ذرا چھوٹا ہو گیا تھا بڑی مشکل سے ایڑیوں پر چڑھا۔ اور کوئی دن ہوتا تو منی بی بی اپنا پیر مڑنے پر خاصا چیختی چلاتی، مگر آج قریب بیٹھی وظیفہ پڑھتی پھوپھی نے اس کی "سی" تک نہ سنی۔

پھر کمال منی بی بی کو اپنی کوٹھریا میں لے جانے لگا تو ماما بی نے اسے للکار کر دوسرے بچوں سے بے انصافی کا احساس دلانا چاہا ۔۔۔۔ لیکن کمال نے ادھر توجہ بھی نہ دی۔ ۔۔۔۔ ایک دم جانے کیوں اپنی بہنوں کے لیے منی بی بی کا دل مچل گیا۔

کمال نے اپنا بکس کھول کر وہ ٹوپی منی بی بی کے سر پر جما دی جس پر خوب ڈٹ کر ستارے اور گوٹا تھپا ہوا تھا۔ اور اوپر رنگین پر کی کلغی لگی تھی۔ یہ وہ ٹوپی تھی جو کمال نے منی بی بی کے لیے اس کی سالگرہ پر خاص اپنے پیسوں سے خریدی تھی، اور جسے امی نے یہ کہہ کر کمال کے بکس میں واپس رکھوا دیا تھا کہ جب تمہارے بچے ہوں گے تو انہیں پہنانا۔

دھوپ کی ترچھی کرنوں میں بڑے مزے کی آنچ تھی۔ منی بی بی نے کمال کے کندھے پر بیٹھے بیٹھے ہر طرف بڑی آسودگی اور مسرت سے دیکھا۔ درختوں سے چڑیاں اترتیں اور نیلے آسمان کے پر پھیلا کر چھوٹی چھوٹی اڑانیں کر کے زمین پر اتر جاتیں اور پھر زمین پر چونچیں مار کر دوبارہ اڑ جاتیں۔ پتھر کی نیالی کھردری سڑک پر کمال کے جوتوں کی نعلیں بج رہی تھیں۔ منی بی بی آنکھیں بند کر لیتی تو گھوڑے کی سواری کا پورا لطف اٹھاتی۔ لیکن وہ آنکھیں کیسے بند کرتی۔ وہ تو دھوپ میں آنکھیں مچکا کر دور سے نظر آنے والے نوسروں کے راون کو دیکھنے کی فکر میں تھی۔

دور سے میلے کا شور منی بی بی کے کانوں تک پہنچتے پہنچتے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ بن گیا تھا۔

ریلوے اسٹیشن سے ڈاکیہ ترن کی ڈاک کا تھیلا لادے آ رہا تھا۔ اس نے منی بی بی کو اس حلیے میں پہچان لیا۔ "کہاں چلی منی بی

بی؟" ڈاکئے نے رک کر پوچھا۔

"میلے جا رہے ہیں۔" منی بی بی نے اس طرح رومانسی ہو کر کہا جیسے سسرال جا رہی ہوں۔ دراصل منی بی بی کا جی چاہ رہا تھا کہ اس کی بہنیں اس کے ساتھ ہوتیں اور اسے اس شان سے میلے جاتے دیکھتیں تو کتنا مزا آتا۔ اتنے بڑے کمال کا کندھا اور اس پر منی بی بی کی سواری.......

منی بی بی نے کمال کے ماتھے تک آئے تیل کی خوشبو محسوس کی اور اپنا منہ پیچھے کی طرف پھیر لیا۔ اس کی باہیں کمال کی پیچ در پیچ بندھی ہوئی پگڑی پر لپٹی ہوئی تھیں۔

میلے کی جھنجھناہٹ اب بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ بھوگی پور کی طرف سے پگڑیوں اور دھوتیوں والے مرد اور لہنگوں والی عورتوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے اکے آتے اور ناہموار سڑک پر کھڑاک کھڑاک کرتے قریب سے گزر جاتے۔ عورتوں اور بچوں لدی ہوئی بیل گاڑیاں "چوں چوں" کرتی رینگ رہی تھیں اور ان میں بیٹھی ہوئی عورتیں میلے جانے کی خوشی میں گھونگھٹوں کے اندر یک دوسرے سے آواز ملا کر جانے کیا گا رہی تھیں کہ ان کی آواز بیل گاڑی کی چوں چاں میں گھل مل گئی تھی... منی بی بی منہ پیچھے کئے بیل گاڑیوں کا تماشہ دیکھ دیکھ کر تھک گئی۔ وہ کمال سے کہنا چاہتی تھی کہ جلدی جلدی چلو مگر گھر سے نکل کر کمال جانے کس موڈ میں تھا کہ کم دھیرے دھیرے چلا جا رہا تھا۔ کندھے پر بیٹھے بیٹھے منی بی بی کا جسم تھک چکا تھا۔

سب میلہ چیخ رہا تھا۔ وہ ہنڈولے کی چرخ چوں اور عورتوں اور بچوں کی مسرت سے بھری چیخیں سن رہی تھی۔ ہری لال اور پیلی اوڑھنیاں ہنڈولے کے چکروں میں جھنڈوں کی طرح لہرا رہی تھیں۔ ناریل کے حقے اٹھائے ہنستے بولتے لوگوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے منی بی بی نے یہ سب دیکھا۔ اور پھر کاغذ اور گتے سے بنے ہوئے اونچے کالے راون کو دیکھا' جس کے منہ کو دیکھنے کے لیے منی بی بی کو اپنا سر اتنا اٹھانا پڑا کہ گردن دکھ گئی۔

کھلونوں اور چاٹ کے ٹھیلے اور عارضی دکانیں اس انبوہ میں جیسے دب گئی تھیں۔ منی بی بی کو یہ اتنے بہت سے لوگ یوں لگے جیسے کمہارن کے ٹوکرے میں بھرے کھلونوں میں جان پڑ گئی ہو..... اور ان کھلونوں کے کسی گھیرے میں بندر ناچ رہا تھا۔ کہیں سانپ والا بین بجا رہا تھا۔ ایک طرف ٹاٹ کا خیمہ لگا تھا جس کے باہر ایک شخص منہ در لگے لومڑی کے دھڑ والی عورت دیکھنے کی دعوت دے رہا تھا۔ قدم قدم پر منی بی بی رک جانا چاہتی تھی۔ مگر وہ تو کمال کے قدموں پر چل رہی تھی۔ اور کمال کم بخت اپنے سارے وعدے بھول کر مجمع سے رستہ بناتا آگے ہی آگے بڑھتا جاتا تھا۔

مارے غصے کے منی بی بی کا گلا بھر آیا اور آنکھوں میں دو آنسو ٹھہر گئے اور آنسوؤں کے پار سے اس نے پیچھے چھوڑی ہوئی

ان ساری چیزوں کو دیکھنا چاہا تو سب کچھ دوہرا نظر آیا۔ ۔ اور پھر اس نے ٹھڑی پر تھوڑی رکھ کر کمال کے چہرے کو دیکھنا چاہا تو

سے کمال کی مونچھیں راون کے فالتو سروں کی طرح دور تک پھیلی اور اکڑی ہوئی لگیں۔

جب کمال ایک کچی دیوار میں جڑے ہوئے پرانے دروازے کے سامنے رک گیا۔

''منی بی بی بھوک لگی ہے؟... .. ''کمال نے اسے کندھے سے اتار کر نیچے کھڑا کرتے ہوئے پوچھا۔

منی بی بی نے مارے غصے کے جیسے ڈھائی من کا سر نفی میں ہلا دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ کمال اس کے غصے کو سمجھے۔ لیکن کمال پر کوئی اثر نہ

ہوا۔

جب اندر سے کواڑ کنڈی کھلی تو وہ کوبر سے لپے تپے آنگن میں تھے۔

باہر میلہ چیخ رہا تھا لیکن یہاں ڈربے کے قریب کھڑی ہوئی کالی مرغی کی ''کٹ کٹ'' صاف سنی جا سکتی تھی جو روئی کے گالوں جیسے

چوزوں کے سامنے چونچ سے دانے اٹھا اٹھا کر ڈال رہی تھی۔ اور کھونٹے سے بندھی ہوئی بکری بھوسی پر منہ مارتے ہوئے کس زور کی

سانسیں لے رہی تھی کہ بھوسی اڑ اڑ جاتی.. .... اور جس عورت نے دروازے کی کنڈی کھولی تھی کیسی بے تکلف تھی کہ اس نے غصے

سے بندوق کی طرح بھری ہوئی منی بی بی کو ایک دم گود میں اٹھا لیا۔

وہ ہنس ہنس کر کمال سے کہہ رہی تھی۔ ''ہم کہیں جھوٹ بولت ہو کہ بٹیا کو بھی ہمرے سنگ لیہو۔ '' اور وہ منی بی بی کو کولھے پر

بڑی آہستگی سے اٹھا کر چلی جیسے منی بی بی نہ ہو کانچ کی چوڑیوں کا توڑا ہو ۔ ۔ پھر منی بی بی اس ہمدردی کی وجہ سے پھوٹ پڑی۔

میلے سے چھٹنے کا غم کوئی کم تھا... . ؟ اور وہ عورت بڑی بے بسی سے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

''کا ہوا! کا ہے روروت ہیں بٹیا۔ کا ہم تم کا کچھ کلیچھو دیتن ہیں؟'' وہ اپنا بھرا بھرا منہ حیرت سے کھول کر پوچھنے لگی۔

''میلہ دیکھنے کو رو رہی ہیں۔ کمال نے اسے اپنی گود میں لیتے ہوئے جھلا کر کہا۔ کمال کی اس بے رخی پر شاید منی بی بی اور

زور سے روئی...

لیکن

''اے تو کا ہے پہلے ہمرے گھر لے آئیو۔ میلہ دکھا لیو پہلے ''عورت بھی منی بی بی کی طرح کمال سے روٹھ گئی۔

''ہم نے کہا پہلے کھیر کھلا دیں ۔ ۔ '' کمال نے ہنستے ہوئے کہا اور عورت کا آنچل تھام لیا۔ لیکن وہ اپنا آنچل چھڑا کر چھن چھن

اپنی جب تھیں بجاتی ڈربے کی طرف بھاگی اور ایک چوزہ مٹھی میں دبا لائی۔ چوزہ اپنے ہاتھ میں لیتے ہی منی بی بی کی ریں ریں رک گئی۔

اب منی بی بی نے عورت کو گوبر کی گول گول تھاپیوں سے سجی ہوئی دیوار کے پس منظر میں غور سے دیکھا جہاں وہ بکری کے برتن میں پانی ڈال رہی تھی۔ منی بی بی کے گھر کی ماما کی طرح اس نے بھی چوڑی دار پاجامہ اور کرتا پہن رکھا تھا ننگے پاؤں جن پر چھم جھمیں بج رہی تھیں اور ہاتھوں میں گھنگھریاں لگی چوڑی چوڑیاں' ناک پر کیل' خوب کسی ہوئی' ریشم بافت والی چوٹی' اور آنکھوں میں پھیلا ہوا کاجل۔۔ منی بی بی نے چوزے کو اپنی فراک کے دامن میں چھپا کر اس عورت کو پہچاننے کی کوشش کی' اور جب وہ چھن چھن کرتی کمرے کے قریب آئی تو کمال کے منع کرنے کے باوجود اس نے کھاٹ پر اطمینان سے بیٹھی ہوئی منی بی بی کو دوبارہ گود لے کر پیار کر لیا —— اور اس وقت منی بی بی کو ماما بی کے جیسے کپڑوں والی عورت کے جسم سے امی کے جسم جیسی خوشبو آئی۔ وہ خوشبو جو بہت سے بہنوں بھائیوں کے ہنگامے میں اسے دور ہی دور سے تڑپاتی تھی۔

وہ تینوں ذرا دیر بعد یک ہی پلنگ پر چھپر تلے یوں سر جوڑے بیٹھے تھے جیسے ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔

منی بی بی نے صاف ستھرے ٹھنڈے چولہے پر تلے اوپر رکھی ہوئی مٹی کی ہنڈیوں کو دیکھا' چھینکے پر رکھے ہوئے امرودوں اور کوٹھری کے دروازے والے کنڈے میں لٹکے ہوئے طوطے کے پنجرے کو دیکھا جس کے اندر طوطا مزے سے ٹیں ٹیں کر کے امرود کتر رہا تھا اس سارے ماحول میں منی بی بی نے سیپے کی آوازیں سننے کی کوشش کی لیکن اس وقت وہ کم بخت عورت ہنڈی سے کٹورا بھر کھیر نکال رہی اور منی بی بی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کھائے کیسے؟ آخر کمال کے کہنے پر وہ یوں کوٹھری کے اندر بھاگی جیسے اس سے بڑی خطا ہو گئی ہو۔ منٹ بھر میں وہ تام چینی کا چوڑا سا چمچہ لے آئی اور اسے اپنے ہاتھ سے چمچے بھر بھر کھیر کھلانے لگی۔ منی بی بی خوب اترا اترا کر کھاتی رہی۔ وہ قریب لیٹا ہوا کمال اینڈ اینڈ کر بار بار کھیر کے لیے اپنا منہ کھول دیتا لیکن عورت نے چمچہ بھر کھیر اسے نہ دینا تھی نہ دی . . . ہاں وہ بار بار کمال کو اس طرح منہ بنا کر گھورتی جیسے امی مہمانوں کے ساتھ منی بی بی کو بدتمیزی پر گھورتی تھیں .. کمال کی یہ گت دیکھ کر منی بی بی کو ہنسی آ گئی۔

پیٹ بھرنے کے بعد شاید منی بی بی پھر سیپے کے بارے میں سوچتی لیکن وہ عورت اتنی مہلت ہی نہ دیتی۔ بار بار صدقے قربان ہو کر کبھی وہ منی بی بی کی پیارے فیشن کی ٹوپی پر لوٹ جاتی اور کبھی منی بی بی کی صورت پر۔ منی بی بی مارے غرور کے پھولی جا رہی تھی۔

منی بی بی مرغی کے بچے سے کھیل کھیل کر تھک گئی تو پھر ضدیں شروع کر دیں۔ عورت کے ہاتھ کی چوڑیاں اتروا کر اپنے پاؤں

میں پھینکیں اور پھر جھم جھم کرتی سارے گھر میں دوڑتی پھری۔ گوبری تھاپیاں دیوار سے اکھاڑ پھینکیں' بکری کو لکڑی سے مارا اور پھر گڑیا کے لیے مچل گئی۔ ان دونوں کا کھانا حرام کر دیا۔

کمال نے نوالے نگلتے ہوئے کہا کہ ابھی میلے سے خرید دیں گے گڑیا۔ لیکن منی بی بی بات مان جاتی تو اس کی بادشاہت میں فرق آ جاتا۔ یا وہ عورت صبر کر جاتی تو تھوڑی دیر میں منی بی بی مرنہ جاتی۔ مگر وہ تو کھانا چھوڑ کوٹھری میں گھس گئی۔ کھونٹیوں پر سے گٹھریاں اتار اتار کر گڑیا بنانے کا سامان جمع کرنے لگی۔ منی بی بی نیم تاریک کوٹھری میں کھڑی اس کے پلو سے کھیلتی رہی۔ جیسے وہ ڈرتی ہو کہ عورت کہیں ادھر ادھر نہ جائے۔

گڑیا کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ منٹوں میں بن جاتی۔ تکیہ کھول کر روئی نکالی گئی۔ پرانا پاجامہ پھاڑ کر کپڑا بیونتا گیا۔

گڑیا کے انتظار میں منی بی بی کی آنکھیں غنودگی سے بھاری ہو گئیں۔ پھر اس نے اپنی بند ہوتی آنکھوں کے سامنے کمال کو عورت کا ہاتھ کھینچتے دیکھا۔

شرم نہیں آرہی ہے۔" وہ بگڑ کر چلائی۔

"ہے تیری..... بڑی شرم والی آئی ہے....." کمال پھنکارا اور پھر منی بی بی نے غنودگی کو جھٹک کر دیکھا۔ عورت کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور وہ گڑیا چپ چپ سی رہی تھی۔ اور کمال۔ کمال کا چہرہ منی بی بی کو اتنا برا لگا۔ اتنا برا کہ وہ ڈر کر عورت کے گھٹنے پر اوندھی ہو گئی۔

پھر منی بی بی نے ایک دیہاتی لوری سنی اور عورت کی گود میں پسر کر سو گئی۔

جب منی بی بی عورت کی گود میں کسمسا کر جاگی تو عورت نے سب سے پہلے اس کے ہاتھ میں گڑیا پکڑا دی۔ گڑیا کے ماتھے پر ستارے کی بندیا اور دوپٹے کے دامن جیسا بھرپور سینہ تھا اور جسم پر گوٹے ستارے سے بھری پشواز تھا۔

کمال گھر میں نہیں تھا۔ ..... باہر میلہ چیخ رہا تھا مگر منی بی بی کو دونوں میں سے ایک کا بھی دھیان نہیں آیا۔ مزے سے گڑیا لیے عورت کے پیچھے پیچھے سارے گھر میں پھرتی رہی۔ عورت نے گھر میں جھاڑو لگائی۔ بکری کی مینگنیاں سمیٹ کر کنارے جمع کیں' مرغی کو اس کے چوزوں کے ساتھ ٹاپے تلے بند کیا۔ طوطے کو امرود دیا اور پھر منی بی بی کا منہ ہاتھ دھلا کر سر میں خوب تیل چپڑ کر ٹوپی جما دی۔ اور پھر آنکھوں میں کاجل لگا کر ماتھے پر انگلی دھبے سے چھوا دی۔

"نظر نہ لگے" اس نے چٹ چٹ منی بی بی کی بلائیں لیں اور خود منہ دھو کر کنگھی کرنے بیٹھ گئی۔

تب کمال آ گیا   حسنہ تصحانے

"گڑیا کا جیور لائے؟" عورت نے سر پر دوپٹہ ڈال کر ذرا بے رخی سے کمال سے پوچھا۔ اور کمال نے رانگے کے زیور کا آنے والا پڑا اس کے سامنے پھینک دیا۔ اور وہ پتنگ کی پنی میں اڑسی ہوئی سوئی لے کر گڑیا کے ماتھے پر جھپکا اور کانوں میں بندے ٹانکنے لگی۔ پھر اس نے گڑیا کے گلے میں رانگے کا ننھا سا طوق اور تلیوں والا ہار پہنایا۔ ہاتھوں میں رانگے کے کڑے اور پاؤں میں جھانجیں۔

"چلو منی بی بی دیر ہو رہی ہے ...." کمال نے یک دم بے صبر ہو کر منی بی بی کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔

"نہیں" وہ جیسے چوٹ کھا کر تڑپی۔

"میلے میں بہت گڑیاں مل جاتی ہیں۔" کمال نے پھر منی بی بی کو گھسیٹا۔ لیکن منی بی بی گڑیا ہاتھ میں لے لینے کے باوجود باہر نہیں جانا چاہتی تھی۔

"تم بھی چلو۔ .." منی بی بی نے عورت کا پلو نہ چھوڑا اور وہ اپنا سر ڈھکی کے ساتھ ساتھ دروازے تک آئی۔

"چلو ہم تمہارے پیچھے آوت ہیں ...." وہ آہستہ سے بولی۔

کمال نے منی بی بی کو کندھے پر بٹھانے کے لیے ہاتھوں میں اٹھایا تو وہ ٹھٹھک گیا۔

"تو نے کاجل لگا دیا منی بی بی کو؟ اور یہ کالا ٹیکا ماتھے پر؟" وہ چیخ کر بولا اور اپنے رومال سے ماتھے اور آنکھوں کا کاجل پونچھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن منی بی بی قابو میں نہ آئیں۔

عورت کچھ نہ بولی۔ پھر وہ چلنے لگے۔ وہ دروازے میں کھڑی رہی۔ منی بی بی نے گردن موڑ کے اسے دیکھا۔ .... پھر وہ دروازے سے نکل کر پیچھے پیچھے بھاگی آئی اور کمال رک گیا۔

"یہ لیا اپنا روپیہ۔ ." عورت نے روپیہ کمال کے سامنے پھینک دیا اور واپس چلی گئی اور منی بی بی کا کلیجہ کھینچ کر اس کے ساتھ چلا گیا۔

اتنے بڑے میلے میں منی بی بی کو تنہائی کا گہرا احساس ہوا۔ وہ سنسناتے میلے سے گزرتی گئی۔

سورج چھپنے لگا تو نوسروں والے راون کو آگ لگ گئی۔ راون کے پیٹ میں بھرے ہوئے پٹاخے شدت سے پھٹنے لگے۔ منی بی بی کو ڈر لگا پھر رام لکشمن اور سیتا کے جلوس کو دیکھ کر وہ ڈر کم ہو گیا۔ لیکن کمال خدا جانے کیوں اسے بہت اجنبی سا لگ رہا

تھی۔

کمال نے منی بی بی کو سارے میلے میں گھمایا۔ چاٹ کی دکان مرمرے والے کا خوانچہ اور مدنی کی برف والے کے پاس باری باری لے گیا۔ گیس کے ہنڈوں اور دودشاخے چراغوں اور لالٹینوں کی روشنی میں دکانیں چمک رہی تھیں۔ کھلونوں کی دکانوں پر بچوں کا ہجوم تھا اس کے باوجود منی بی بی کمال کے کندھے پر گم سم بیٹھی رہی۔ کمال اس سے بار بار پوچھتا۔ یہ لو گی" وہ لو گی؟ لیکن منی بی بی تو بالکل سادھو ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود کمال نے بساطی کی دکان سے کاجل کی ننھی سی ڈبیا خریدی۔

"دیکھو منی بی بی کسی کو بتانا نہیں کہ کاجل کس نے لگایا تھا ....." کمال نے اسے ہدایت کی۔

"اچھا۔"

"اور دیکھو کہنا گڑیا کمال نے دکان سے خریدی تھی ۔"

"اچھا" منی بی بی نے بے دھیانی سے کہا۔ کیونکہ وہ تو کمال کے کندھے پر بیٹھی' میلے کے بیچ میں' لوگوں کے ایک دائرے میں کھڑی ہوئی ایک عورت کو دیکھ رہی تھی' جس کے پیچھے ڈھولکیا اور ہارمونیم والا سرتال درست کر رہے تھے .... اور مشعلچی' دوپٹے کا پلو ٹھیک کرتی ہوئی اس عورت کے آگے بوتل پر ناچتے ہوئے شعلے کو ابھار رہا تھا..... شعلے کی روشنی میں پوڈر سے سفید کئے ہوئے چہرے والی عورت بار بار اپنا دوپٹہ ٹھیک کر رہی تھی' دوپٹہ .... جس کے ایک آنچل پر تو پکا گوٹا موجود تھا مگر دوسرے آنچل پر غائب

منی بی بی کو یاد آیا۔ ایک رات غنودگی کے عالم میں اس نے اپنے گھر کے دروازے پر اسے ناچتے دیکھا تھا اور پیسے دیئے تھے اور سب نے کہا تھا کہ گناہ ہو گیا تم سے۔

"کمال .... کمال ..... وہ! ..... وہ عورت ..... " منی بی بی خوفزدہ ہو کر کمال کو ادھر متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن کمال میلے سے باہر آ رہا تھا۔

رستے میں کمال کی پگڑی سے لپٹے لپٹے منی بی بی نے بہت سی ہدایتیں سنیں۔ وہ دھیرے دھیرے، کچھ کہتی اور پھر اچانک دکھ میں ڈوب جاتی۔ میلہ آہستہ آہستہ دور ہو گیا۔ اور منی بی بی کا دل وہیں کہیں میلے میں کھو گیا۔ اسے اپنا مرغی کا چوزہ یاد آنے لگا۔ اور وہ عورت جس پر وہ ایک دن کے لیے حاکم بن گئی تھی۔

رات کو گھر پہنچ کر کمال نے منی کو کندھے سے اتارا تو ابامیاں جھپٹ کر کمرے سے نکلے اور آتے ہی کمال کے سامنے پہنچے۔

"کہاں اد ہادن بھر "

"میلے میں صاحب . . "

"حرامزادے ۔میں نے خود تجھے اس رنڈی کے گھر سے نکلتے دیکھا "ابا میاں دھاڑے اور پھر کمال کے منہ پر الٹے سیدھے کئی تھپڑ برس پڑے۔ پگڑی کھل گئی۔ اور کمال سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ ابا میاں اندر چلے گئے۔

منی بی بی گڑیا دبوچے 'سہمی ہوئی' ابڑی ای کے قریب چلی گئی۔ لیکن کمال کو یوں پٹتے دیکھ کر منی بی بی کا دل اس کے لیے حقارت آمیز رحم سے پر ہو گیا۔

"یہ گڑیا . . پھر دلا دی اس کم بخت نے؟ جانے کیسی گندی روئی بھری ہو گی" ای نے چلا کر کہا۔ اور منی بی بی نے گڑیا لے کر آسمان پر اڑ جانا چاہا۔

"چھی چھی..... گندی چیز..... " ای نے گڑیا اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ پھر انہوں نے لالٹین کی روشنی میں گڑیا کو غور سے دیکھا۔

یہ کس نے دی ہے تم کو؟" ای نے ذرا مسکرا کر پوچھا۔

منی بی بی نے تکیے کی روئی کا حوالہ دیتے ہوئے سچ بات کہہ دی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اب اتنی صاف ستھری خوبصورت گڑیا ای اسے واپس کر دیں گی۔

"اے ہے ذرا دیکھنا۔ یہ گڑیا بنائی ہے یا پوری عورت... توبہ 'یہ خراب عورتیں بچوں تک کو اپنے ہتھکنڈوں سے خراب کرتی ہیں... " ای بڑبڑائیں۔ گڑیا کا دوپٹہ الٹ کر دوبارہ اس کا ماڈرن جیسا ابھرا ہوا سینہ دیکھا اور گڑیا ماما کی طرف اچھال دی۔ "لو اسے چولہے میں ڈال دو۔

اور ماما نے گڑیا بڑے غصے سے چولہے میں جھونک دی۔ پھر جو وہ اپنا بھاری بھر کم جسم ہلاتی لوٹیں تو منی بی بی ڈری کہ کہیں ماما اسے بھی چولہے میں جھونکنے تو نہیں آ رہی ہیں۔

"خراب عورت. خراب عورت!" منی بی بی کو سمجھ میں نہیں آیا کہ عورت کون ہوتی ہے

اور منی بی بی جھکر اتنا روئی اتنا چیخی کہ ابا میاں کو کمرے سے دوبارہ نکل کر اس پر تھپڑ برسانے پڑے۔

◆◆◆

چاند کے دوسری طرف

تاج محل ہوٹل کے سامنے سے پہلے بھی کبھی کبھار گزرا ہوں' لکڑی کے بھدے سے کیبن اور سیمنٹ کے تھڑے والی چائے کی دکان پر "تاج محل ہوٹل" کا بورڈ دیکھ کر مسکرایا بھی ہوں۔ لیکن پچھلے دو مہینے سے یہ ہوٹل میری زندگی کے نئے راستے کا ایک اہم موڑ بن گیا ہے۔ جہاں میں اپنی پرانی سائیکل کو ہر روز بریک لگاتا ہوں اور ایک پاؤں فٹ پاتھ پر ٹکا کر بے فکروں کی طرح بوڑھے دکاندار سے کہتا ہوں۔ "دو پیالی اسپیشل چائے ادھر بھجوا دو۔

"ابھی لیجیے حضور۔ بس آپ کے پہنچنے کی دیر ہے۔" وہ بڑی مستعدی سے جواب دیتا ہے اور پنکھے سے کوئلے دھونکتا ہوا گلگتی چھوکرا مجھے دیکھ کر مسکراتا ہے اور واقعی ابھی میں اپنی سائیکل کو برآمدے کے پاس روک کر تالا لگاتا ہوں "شہر کے صاحب" والے سلام قبول کرتا' جبار کے کمرے میں قدم رکھتا ہوں کہ گلگتی چھوکرا تیر کی طرح وہاں پہنچ جاتا ہے۔ دودھ شکر والی چائے کی کیتلی اور دو ثابت پیالیوں سے بھری ٹرے جبار کے سامنے رکھ دیتا ہے اسے سلام کرتا ہے اور کمرے سے ہوا ہو جاتا ہے۔

اچھے میزبانوں کی طرح' آج بھی جبار نے خود ہی پیالیوں میں چائے انڈیلی' ایک میری طرف بڑھائی اور دوسری پیالی سے ایسے زوردار گھونٹ لیے جیسے حقے کے چیمبر سے چائے کھینچ رہا ہو۔

میرے ساتھ چائے پیتے ہوئے جبار ہمیشہ شعروادب کی بات اس طرح چھیڑتا ہے جیسے مدارات کے طور پر کیک کے ٹکڑے مجھے پیش کر رہا ہو۔ یہ لمحے میرے لیے دوبھر ہوتے ہیں کیونکہ میرے سامنے تو اپنے ڈیسک انچارج کا چہرہ ہوتا ہے۔ جس نے دفتر میں قدم رکھتے ہی پہلے دن جتا دیا تھا کہ "دیکھیے صاحب خیال رہے۔ یہ افسانہ نویسی تو ہے نہیں کہ جب تک چاہے بیٹھ کر الفاظ کے موتی جڑتے رہے۔ یہاں تو گھڑی کی سوئیاں دیکھ کر کام کرنا ہوتا ہے۔ سمجھے آپ؟

میں نے تو اپنے انچارج صاحب کی بات سمجھ لی تھی لیکن جبار کو نہیں سمجھا سکتا تھا اس لیے حسب معمول آج بھی جبار برسوں پہلے پڑھی ہوئی ایک کہانی کا ذکر کر رہا تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ میرا سر پتھر کا ہو گیا ہے۔ اور میرا جی چاہنے لگا کہ یہ پتھر اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر جبار کے منہ پر دے ماروں لیکن جبار جوں ہی چائے کا آخری گھونٹ لے کر اپنی مونچھیں پونچھتا ہے اور میز کا دراز کھولتا ہے تو میرے دل میں جبار کے لیے اسکول اور کالج کے زمانے والا پیار ہلکورے لینے لگتا ہے۔

"اچھا یار اب تم اپنے راشن کا کوٹہ سنبھالو۔" جبار بڑی وضع داری سے یہی فقرہ روز کہتا ہے۔ اس کے باوجود یہ فقرہ سن کر میری مسلسل بے معنی سی مسکراہٹ بے ساختہ قہقہے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جبار کا یہ فقرہ دلچسپ ہو یا نہ ہو۔ اس میں سچائی ضرور تھی۔

"مجید دیکھو اندر کسی کو نہ آنے دینا میں کام کر رہا ہوں۔" جبار نے دروازے والے سپاہی کو روز کی طرح حکم دیا اور تھانے کا روزنامچہ یوں کھولا، جیسے کسی امیر مرنے والے کا وصیت نامہ اور میری نظریں اس پر بھنگی مکھیوں کی طرح رینگنے لگیں۔ اس روزنامچے میں درج ہونے والے جرائم ہم دونوں کی روزی کا جواز ہیں۔ جبار چھ سات سال پرانا پولیس افسر ہے اور میں ایک نئے اخبار کا دو ماہ پرانا کرائم رپورٹر ہوں۔ جبار کے ابا پولیس سے ریٹائر ہوئے تو پولیٹیکل برانچ میں ان کی خدمات کے پیش نظر جبار کو ملازمت بی اے کے امتحان کا نتیجہ نکلتے ہی مل گئی۔

میرے ابا اسکول ماسٹر تھے اس لیے وہ مجھے اعلیٰ تعلیم کے بعد کم از کم یونیورسٹی لیکچرر تو دیکھنا ہی چاہتے تھے۔ اس لیے میں پڑھتا رہا لیکن مشکل یہ تھی کہ اسکول ماسٹر کی خدمت کے اندراج کا کوئی خانہ تو ہوتا نہیں۔ اس لیے مجھے یونیورسٹی کیا اسکول میں بھی ملازمت نہ ملی۔ اس زمانے میں جبار جب بھی ملتا تو کہتا۔ "یار گھر بسانے چلو گے تو رسالوں میں تمہارا نام چھپنے سے کام نہیں بنے گا۔ اس لیے کوئی نوکری ڈھونڈو کوئی نوکری"

اور اب بالکل اتفاقاً مجھے یہ نوکری مل گئی۔ جسے کچی کرنی میں جبار ایک اچھے دوست کی طرح میری مدد کر رہا تھا۔ وہ نہ صرف بچے تھانے میں رپورٹ ہونے والے جرائم کی تفصیل مجھے لکھوا تا بلکہ دوسرے تھانوں سے بھی میرا کام نکلوا دیتا ورنہ ایک نئے اخبار کے وناڑی کو دفتر میں اچھی کارکردگی دکھانے میں خاصی پریشانی ہوتی۔

میں نے اپنی نوٹ بک اور پنسل سنبھالی تو جبار نے کل شام سے آج تک ہونے والے جرائم کی تعداد اور پھر سب سے پہلے رپورٹ میں قتل کے کیس کی تفصیلات مجھے بتائیں۔ میں نے اسے نفسیات کو بھلا کر خالص اخباری انداز سے محبت کی مجرم اٹھارہ سالہ خوبصورت مقتولہ کو بدکردار اور سفاک قاتل کو غیرت دار شوہر کا لقب دے کر لکھنا شروع ہی کیا تھا کہ جبار کے کمرے کے باہر ایک ہنگامہ ہوا جس میں مجید اور دوسرے سپاہیوں کی گالیوں کے ساتھ کوئی پاگلوں کی طرح چلا رہا تھا۔ "مجھے اندر جانے دو۔ ابھی اندر جانے دو" اور پھر خاصی دھاچوکڑی ہوئی۔

"نہ جانے کون ماں کا   ہے۔" جبار نے اپنی حکم عدولی کے خواہشمند ان دیکھے آدمی کو گالی دی مگر گالی کا لفظ منہ میں گڑگڑا کر نگل گیا۔ میری موجودگی میں وہ اب بھی ذرا جھجکتا تھا۔

"آنے دو بھائی میں اپنا کام کرتا رہوں گا۔" میں نے جلدی جلدی پنسل گھسیٹتے ہوئے کہا میں اپنا کام جاری نہ رکھ سکا۔ قتل اور خون کی خبریں بنانا اور بات ہے خون بہتے دیکھنا اور بات۔ اندر آنے والے کے ماتھے سے بہتا ہوا خون اس کے چہرے کو عجیب بھیانک رنگ دیتا ہوا اس کے اوور کوٹ پر ٹپک رہا تھا۔ میں نے چکرا کر اپنے حلق میں ابکائی روکی۔

"جناب میں نے تو اس آدمی کو صرف اندر آنے سے روکا تھا۔ اس نے اپنا سر دیوار سے ٹکرا کر خود پھوڑا ہے۔ یہ اقدام خودکشی کا کیس ہے۔" اندر آتے ہوئے سپاہیوں میں سے ایک نے کیس کی نوعیت کا فیصلہ تیزی سے کر دیا اور جبار نے گھور کر اسے دیکھا۔ تھانے کے احاطے میں کسی کا یوں کھلے بندوں زخمی ہونا خاصی اہم بات ہو سکتی ہے۔

"اسے بٹھا دو۔ اس کا خون بند کرو۔ ٹھنڈے پانی کا کپڑا رکھ کر دباؤ" زخم کو جبار نے ہدایات جاری کیں تو کمرے میں موجود ہر شخص نے عمل کرنا چاہی۔ کئی رومال کونے میں رکھی صراحی کے ٹھنڈے پانی میں بھیگ گئے۔ جبار نے اپنا رومال اس کے ماتھے پر رکھ کر ہتھیلی سے دبا لیا۔ میں نے اپنے رومال سے اس کا خون آلودہ چہرہ صاف کیا اور اس کا سر کرسی کی پشت پر ٹکا دیا۔ مجید کا بڑا سا رومال اس کے اوور کوٹ سے خون کے دھبے مٹانے کی بے سود کوشش میں کام آیا۔

"جی بڑی مہربانی آپ کی۔" اس نے انسانیت سے جبار کا ہاتھ اپنے ماتھے پر سے ہٹا کر اس جگہ اپنا ہاتھ رکھ لیا۔ ہم سب خاموش تھے اور اس کے دہشت زدہ چہرے کو دیکھ رہے تھے۔

"رپٹ لکھوانا تھی جی۔" زخمی اجنبی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"کس بات کی؟" جبار نے کرسی پر بیٹھ کر پوچھا۔

"جی پہلے آپ شروع سے ساری بات سن لیں۔۔۔۔۔" اجنبی نے شرط پیش کی اور میں جبار کی طرف دیکھ کر مسکرایا جیسے شرط ماننے کی سفارش کر رہا ہوں۔

"ہوں اچھا ہر بات سچ سچ بتاؤ۔ کوئی جھوٹ نہ ہو۔ سمجھے؟"

"اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں صاحب۔ زبردستی آیا ہوں۔ جھوٹ کیوں بولوں گا؟" اس کے سوکھے ہوئے سیاہ ہونٹوں پر ایک حقارت آمیز مسکراہٹ پر ماری گزر گئی اور ماتھے کے رومال پر رکھا ہوا ہاتھ کانپتا رہا۔

"صاحب آپ تو جانتے ہیں کہ اپنی اولاد سبھی کو خوبصورت لگتی ہے مگر میری سالی کو پاس پڑوس والے برادری کنبے والے بھی خوبصورت سمجھتے۔ کوئی اسے پری کہہ کر پکارتا' کوئی شہزادی' کوئی سوہنی۔" وہ کہتے کہتے رکا۔

"پھر اس نے آنکھ لڑا لی کسی سے۔" رپورٹ لکھوانے کے اس مریل طریقے سے جل کر کمرے میں موجود ایک سپاہی نے اسے ٹھوکا دیا۔ ویسے یہ بات ٹھیک ہے کہ تھانوں اور عدالتوں میں حسن کا ذکر عشق کے بغیر آتا ہی نہیں۔ ایسے موقع پر تھانے میں بیٹھے ہوئے کسی بھی باپ کا سر جھک سکتا تھا لیکن بیان دینے والا اچھل کر کرسی پر سیدھا بیٹھ گیا۔ ماتھے کا گیلا رومال اس کی گود میں گرا اور ماتھے کے زخم سے خون کے قطرے پھر اس کے چہرے پر پھسلنے لگے۔

"دیکھیں جی تھانے دار صاحب۔ آپ بے شک مجھے جوتے ماریں' ڈنڈے ماریں' گالی دیں' مگر میری لالی کو کسی نے ایسی بات کی تو میں۔ .. تو میں ..... " وہ غصے سے کانپتے ہوئے ہونٹ کاٹنے لگا۔

جبار نے سپاہی سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا اور پھر حکم دیا۔ "اس کے زخم پر ٹھنڈا پانی ڈالو۔ اور دیکھو پٹی باندھ دو تو بھی ہے۔ ہاں کیا نام ہے تمہارا؟"

"تاج دین۔"

"دیکھو تاج دین اپنا سر کرسی سے لگائے رکھو۔ سمجھے؟ کرسی گندی نہ کرو۔" جبار کے احکام کی تعمیل ہو رہا ہو گئی۔

"جی ایسی بات زبان سے نکالی میری لالی کے لیے۔ ہنہ۔ صاحب۔ صاحب جی میری لالی کی بیٹی کا ماں جس سے مرضی ہو جا کر کنبے میں پوچھ لیں۔ وہ تو جناب جب سے بڑی ہوئی ہے گھر سے اکیلے قدم بھی نہیں نکالا۔ دروازے میں بھی کھڑی نہ ہوئی۔ وہ تو اپنی ماں پر چلی گئی صورت میں بھی' طبیعت میں بھی۔"

"اچھا تو لالی کی ماں خوبصورت ہے؟"

"اب کہاں جی۔ ہاں جب میں اسے بیاہ کر لایا تو سب کنبے برادری کی عورتیں کہتیں تاج دین تیرے گھر تو چاند اتر آیا ہے۔ میری ماں جب تک جیتی رہی اسے بہت تکلیف دیتی رہی اور میں بھی ماں کے کہنے میں رہا۔ پھر بھی لالی کی ماں نے مجھ سے نہ کبھی زبان چلائی' نہ کبھی کچھ مانگا۔ بس میری خدمت کرتی رہی۔ کنبے میں جا کر جس سے چاہیں پوچھ لیں۔ کبھی کسی نے اس کی طرف انگلی اٹھائی؟"

"اچھا اچھا۔ ٹھیک ہے۔ آگے بیان کرو۔" جبار تیزی سے بولا۔

"جی وہ میرے بچوں کی ماں بنی۔ آٹھویں لالی ہوئی تو۔" وہ رک کر سوچنے لگا۔

"لالی پیدا ہوئی تو کیا ہوا؟" پوچھا گیا۔

"جی اس کی ماں نے لالی کو میری گود میں ڈال کر کہا۔ "لو تمہارے گھر تو چاند اترا ہے۔ جناب، لالی کی ماں نے سات بچوں میں سے کوئی بچہ میری گود میں اس طرح نہ ڈالا تھا۔"

"پھر تم نے کیا کہا؟" میں بے ساختہ بول پڑا۔ میری موجودگی تھانے کی فضا کو یکسر بدل رہی تھی۔

"جی کہنا کیا تھا۔ بس لالی مجھے سب اولاد سے زیادہ پیاری ہو گئی۔ وہ بھی مجھے بہت چاہتی۔ کسی کی گود میں ہوتی تو مجھے دیکھ کر بانہیں پھیلا دیتی۔ کبھی اس کی ماں اپنے پاس سلاتی تو رات کو جاگ کر روتی اور جبھی چپ ہوتی جب میری چھاتی پر لیٹ جاتی۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا وہ بتاؤ" جبار اب خاصا بے چین ہو رہا تھا۔

"جی میں نے پانچ بیٹیاں بیاہیں۔ دو بہویں گھر لایا۔ مگر لالی کی ماں نے میری پسند میں کوئی دخل نہ دیا۔ پھر لالی بڑی ہونے لگی تو ایک رات میری پاؤں دباتے ہوئے بولی ــــــ

..... "لالی کے بابا میں نے تم سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ اب لالی کے لیے تم سے اس کے جوڑ کا خوب صورت دولہا مانگتی ہوں۔ یاد رکھنا۔ اور جی میں نے اس کی بات گرہ میں باندھ لی۔"

اتنا کہ کر تاج کی آواز بھرا گئی اور اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور میں نے دیکھا کہ تھانے کے اس کمرے میں مقصود سپاہی جھلائے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ اپنی انگلیاں اس شخص کے حلق میں ڈال کر ایک ہی بار ساری بات کھینچ کر اپنے افسر کی میز پر رکھ دیتے۔ یہ کیا کہ کبھی لالی کا ذکر اور کبھی لالی کی ماں کے قصے۔ وہ بار بار جبار کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جو غالباً میری موجودگی کی وجہ سے بڑا گھمبیر بنا بیٹھا تھا۔ کیونکہ میں اس بیان میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔

"ہوں پھر تم کو لالی کے لیے مناسب رشتہ ملا؟" سوال ہوا۔

"رشتے تو بہت تھے۔ جناب۔ لالی کے چچا کے بیٹے رشتے ناتے اور برادری میں بھی لڑکے تھے۔ سبھی نے لالی کا ڈولا مانگا۔ مگر جی مجھے تو اچھی شکل والے رشتے کی تلاش تھی۔ اس لیے میری لالی سترہ سال کی ہو گئی۔

میری اور جبار کی آنکھیں بے ارادہ ہی ایک دوسرے کی طرف اٹھ گئیں۔

"صاحب آپ عقل والے ہیں۔ بیٹی چاہے پنجرے میں بند لال جیسی ہلکی پھلکی ہو پھر بھی سب کہتے ہیں ارے یہ پہاڑ سی بیٹی کا بوجھ کب تک اٹھائے رہو گے۔ اس کی عمر اب سسرال جانے کی ہے۔" تاج دین کی غیر ضروری تفصیلیں سے جبار کے صبر کا پیمانہ چھلکنے

"ہاں ہاں ایسا ہی کہتے ہیں لوگ۔"

"مگر جی لالی تو کہیں بھی نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ تو اپنے ماں باپ سے اتنا پیار کرتی کہ ایک دن کے لیے بھی اپنی بیاہی بہنوں کے گھر نہ گئی۔ میں بتاؤں صاحب! ایک دفعہ اس کی ایک بہن کو ضد ہوگئی کہ رات لالی میرے پاس رہے گی۔ اس پر لالی بچوں کی طرح میرے سینے سے لگ کر رونے لگی اور میرے ساتھ ہی گھر لوٹ آئی۔"

وہ جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔

"تو پھر کوئی مناسب رشتہ نہیں ملا لالی کے لیے ......" میں نے مداخلت بے جا کی۔

"ہوں تو کوئی رشتہ نہیں ملا تمھاری بیٹی کے لیے۔" جبار نے فوراً اپنی ڈیوٹی سنبھال لی اور تاج دین چونک اٹھا۔

"رشتہ ملا جی۔ ایک دن وہ لوگ آپ ہی کی راشن شاپ والے سے پتہ پوچھتے میرے دروازے پر آ گئے۔ انہوں نے افضل حسین ولد محمد حسین کی بڑی تعریفیں کیں۔ اپنا گھر۔ ہاتھ میں ہنر۔ سر پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ مستقل میں اچھی نوکری پر جا رہا ہے۔ شادی جلدی چاہیے۔ انہوں نے ہی گھر اور محلے کا پتہ بھی دیا کہ جا کر تصدیق کر لو۔ میں نے کہا پہلے لڑکا دکھاؤ۔ پھر جی انہوں نے لڑکا بھی دکھا دیا۔" تاج دین نے ٹھہر کر پانی مانگا۔

"کیسا تھا لڑکا؟" جبار نے جلدی سے پوچھا۔

"لڑکا تو صاحب بڑا لمبا، مضبوط اور جنٹلمین تھا۔ پھولدار قمیض اور کالی پتلون میں ایسا لگتا جیسے پھولوں میں پھول گلاب ہوتا ہے۔" تاج دین کی آنکھیں یوں چھت کی طرف تک رہی تھیں جیسے وہاں مکڑی کے جالوں کے بجائے گلاب کے پھول کھل رہے ہوں۔

"پھر تم نے فوراً رشتہ طے کر لیا؟"

"نہیں جی۔ پہلے اس کے گھر بار کی تصدیق تو کرنا تھی۔ میں جی اس کے محلے پہنچا اور افضل حسین ولد محمد حسین کے بارے میں پوچھا۔ کوئی بات بھی جھوٹ نہ تھی۔ میں اس کے گھر بھی گیا اس کی چابی موجود تھی۔ اس نے میری بڑی خاطر کی۔ میں نے بات پکی کر دی۔ اگر وہ پکے گھر کا مالک نہ ہوتا میری طرح کا مزدور ہوتا تب بھی میں بات پکی کر دیتا۔ لالی کی ماں کو تو اتنا خوش میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ صاحب سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس کے بعد ہی معلوم ہوا کہ خوش عورت کیسی ہوتی ہے۔"

"لالی بھی خوش ہوئی؟" میں پوچھ بیٹھا۔

''کہیں شریف نیک لڑکیاں اپنے بیاہ پر خوش ہوتی ہیں؟'' میں نے تو بتایا صاحب وہ تو ایک دن کے لیے بھی گھر چھوڑنے کو راضی نہ ہوتی تھی۔ اب تو اس کے بارات دوسرے شہر سے آ رہی تھی اور اسے بیاہ کر سمندر پار بھی جانا تھا۔ اسے تو رونا ہی تھا جناب'' یہ کہتے کہتے تاج دین کا گلا بھر آیا۔

''مہندی والی رات سارا گھر سو گیا۔ مگر وہ سسکیاں لیتی رہی۔ میں بھی برآمدے میں لیٹا جاگ رہا تھا۔ اٹھ کر اس کے پاس چلا گیا۔ پھر تو جی وہ مجھ سے لپٹ کر بہت روئی۔ اسے اپنے ہاتھوں کی مہندی کا ہوش بھی نہ رہا۔ وہ بار بار کہتی بابا میں کہیں نہ جاؤں گی تمہیں چھوڑ کر۔۔۔ پھر جی میں نے بے حیائی لاڈو کر اسے سمجھایا کہ لڑکا شہزادوں جیسا ہے۔ کما تا پیتا ہے اور وہ اپنے گھر جا کر کتنی خوش رہے گی اور جب وہ خوش ہوگی تو میں بھی خوش ہوں گا۔ بس میری باتیں سن کر میری لالی آرام سے سو گئی۔ ''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ پھر بارات آئی؟'' جبار بیان کی تہہ تک پہنچنے کو بے قرار تھا۔

''ہاں جی بڑی شاندار بارات آئی۔ پھولوں سے سجی ہوئی۔ بس میں سے براتیوں کے ساتھ باجے والے بھی اترے۔ دولہا نے گلاب کے پھولوں کا سہرا باندھا تھا۔ گلے میں نوٹوں کا اتنا بڑا ہار تھا کہ گھٹنوں کو چھو رہا تھا اور جی اسے نے کشمیری دوشالہ بھی جسم سے لپیٹا تھا۔ سردی بھی تو بہت ہے آج۔ ہے نا سردی؟''

جبار نے انگریزی میں مجھ سے کہا۔ ''یہ تو مجھے پاگل خانے سے بھاگا ہوا لگتا ہے۔''

''اس کے آگے کیا ہوا؟'' مجیدا اپنے افسر کی بے بسی دیکھ کر بولا۔

''جی ہونا کیا تھا۔ برات آنے پر نکاح ہوتا ہے۔ میری لالی کا نکاح افضل حسن ولد محمد حسن مرحوم سے پڑھا دیا گیا۔ تھانے دار صاحب ایک بات تو بتاؤ۔ سہرا کیوں باندھتے ہیں دولہا کے؟۔۔۔ '' تاج دین نے جبار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک دم پوچھا۔

تھانے میں آنے والے سوال کا جواب دیتے ہیں۔ سوال نہیں کرتے۔

اس سے پہلے کہ جبار اس گستاخی پر گالی بکتا میں بول پڑا۔

''ارے تاج دین سہرا اس لیے باندھتے ہیں کہ سہرا الٹا جائے اور مہماں دولہا کی صورت دیکھیں۔''

''ہاں جی اور پھر دولہا کی شکل دیکھ کر لالی کے باپ پر جوتے ماریں کہ ارے تاج دین اپنی چاند جیسی بیٹی کے لیے یہی بھوت جیسا آدمی ملا تھا تجھے؟ کہتا تھا اپنی بیٹی کے لیے اس کا جوڑ کا دولہا لاؤں گا۔ تو نے چہرہ دیکھا۔ تو نے لالی کی۔ جی میں تو شرم میں گڑ

گیا۔" یہ سب کہتے ہوئے وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

"اچھا۔ ہوں۔ تمہارے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔ تم کا کوئی اور دکھایا تھا۔ مجید اسے پانی پلاؤ۔"

دو گھونٹ پانی پی کر اس نے ہونٹ پونچھتے ہوئے پھر کہنا شروع کر دیا۔

"اللہ بھلا کرے آپ کا۔ آپ سمجھ گئے۔ یہی بات ہے۔ میں نے سب کے سامنے چلا چلا کر کہا۔ مگر کسی نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ یہ دیکھ کر براتی مجھ سے جھگڑنے لگے۔ میں نے کہا۔ میں تھانے میں رپٹ لکھوانے جا رہا ہوں۔"

"اچھا تو تم دھوکہ دہی کی رپورٹ درج کرانے آئے ہو؟" ایک کانسٹیبل یوں اچھلے کودے ہوئے بولا جیسے چوہے کی دم کھینچ رہا ہو۔

"نہیں جی مجھے تو بزرگوں نے پکڑ لیا اور سمجھانے لگے کہ تاج دین تو غریب آدمی ہے کہاں تھانے کچہریوں میں پیشیاں بھگتے گا؟ وکیلوں کو کھلانے کے لیے کہاں سے لائے گا؟ اور پھر یہ پیسے والے لوگ ہیں جھوٹی گواہیاں پیش کر دیں گے۔" تاج دین بولتے بولتے رکا۔

"اس کے بعد کیا ہوا؟" جبار نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"جی میں نے کہا میں سالی کا ڈولا ان دھوکے بازوں کے حوالے نہیں کروں گا۔ چاہے جان چلی جائے۔" آخری فقرے پر وہ زور سے رو دیا۔

"ہوں۔ اس کے بعد تم نے کیا کیا؟" جبار نے سختی سے پوچھا۔

"میں اپنی بات پر اڑا رہا۔ باراتی پہلے تو دھمکیاں دیتے رہے۔ پھر اپنی پگڑیاں اور ٹوپیاں میرے بھائیوں کے پیروں پر ڈالنے لگے۔ بزرگوں کے گھٹنوں کو ہاتھ لگائے اور میری بیٹیوں داماروں کے سامنے ہاتھ جوڑنے لگے۔ کئی مہمانوں کو کونے میں لے جا کر جانے کیا کیا باتیں کیں۔ پھر جی۔ وہ لوگ جو مجھ پر ہنس رہے تھے۔ طعنے دے رہے تھے۔ وہ سب دولہا کے حمایتی بن گئے۔ میرے بھائی مجھے اللہ رسول کا واسطہ دینے لگے اور میرے بیٹے داماد الگ ہو کر یوں بیٹھ گئے جیسے ساری غلطی میری ہے اور پھر جی مولوی صاحب نے کھڑے ہو کر کہا تاج دین بندے کی قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے اس کے اسباب پیدا ہوتے ہیں۔ دلہن اب افضل حسین ولد محمد حسین مرحوم کی منکوحہ ہے جو ہونا تھا ہو گیا۔ اٹھو اب دیگیں ٹھنڈی ہو رہی ہیں۔ مہمانوں کو کھانا کھلاؤ۔ اور جب میں مولوی صاحب کے کہنے سے بھی نہ اٹھا تو بھائیوں نے اور بیٹوں نے کام سنبھال لیا۔"

''ہوں۔ پھر تم نے کیا کیا یہ بتاؤ؟''

''جی میں کیا کرتا مجھے تو سب نے سڑک کے روڑے کی طرح ایک طرف پھینک دیا۔ آپ بتائیں جی میرا کیا قصور تھا جو سب نے میرا اختیار چھین لیا؟'' پھر جی وہ سب میری رانی کو رخصت کرنے لگے۔'' وہ پھر چپ ہو گیا۔ کمرے میں بھی سب چپ رہے۔

''جب رانی سسرال جانے کو نکلی تو عورتوں کے پیچھے لالی کی ماں بھی دوپٹے میں منہ چھپائے باہر آ گئی۔ اس نے مجھے کتے کی طرح ایک طرف ہانپتے پایا تو وہ بات کی جو پہلے کبھی نہ کی تھی۔'' تاج دین کی سیاہ گردن کی نوکیلی ہڈی تھوک نگلنے کی کوشش میں بار بار حرکت کرنے لگی۔

''کیا لالی کی ماں نے؟'' جبار نے پوچھا۔

''کہنے لگی تاج دینے! تجھے کیا پتہ تیرے جیسے بدشکلوں کے ساتھ چاند جیسی لڑکیاں کس آگ میں جلتی ہیں۔ میری کلی جیسی رانی کو اپنی آنکھوں کے سامنے بھاڑ میں جانے دے رہا ہے۔ تو نے مجھے زبان دی تھی۔ اب دوسروں کی بات مان گیا۔ اگر تو مرد ہے تو اسے نہ جانے دے۔''

''اس کے بعد تم نے کیا کیا۔ سچ بتاؤ۔'' جبار کرسی پر سیدھا ہو گیا۔

ہاتھ میں آ گئی . . . اور . . . اور جی میں . . . بس میں سوار ہوتی برات کے پیچھے بھاگا۔ افضل حسین بس کے دروازے میں کھڑا تھا۔'' اس نے کانپتے ہونٹوں سے پانی کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگانا چاہا مگر سارا پانی اس کے اوورکوٹ پر گر گیا۔ کمرے میں موجود ہم میں سے کسی نے بھی کوئی سوال نہ کیا۔ جیسے ہم سب اپنی آنکھوں سے تاج دین کو افضل پر حملہ آور دیکھ رہے ہوں۔

''اس کے بعد۔ اس کے بعد رانی دو بانہیں پھیلا کر میرے سینے سے لپٹ گئی اور چیکے چیکے کہنے لگی۔ بابا مجھے جانے دیجئے۔ یہ آدمی بھی تو تمہارا جیسا تھا۔ تم مجھے کتنا چاہتے ہو۔ یہ آدمی بھی مجھے . . . اللہ جانے افضل کے بارے میں کیا کہنا چاہتی تھی . . . ؟'' تاج دین نے سوالیہ نظروں سے سب کی طرف دیکھا تو اس کے چوڑے اندھیرے غاروں جیسے نتھنے لوہار کی دھونکنی کی طرح پھیلنے سمٹنے لگے اور وہ اپنے پرانے اوورکوٹ کے بٹن کھولتے ہوئے یوں کرسی سے کھڑا ہو گیا جیسے بیٹھا رہا تو اس کا دم گھٹ جائے گا۔

''اچھا تو تم نے افضل حسین کو '' جبار بولا تو تاج دین نے تیزی سے جواب دیا۔

''نہیں جی۔ افضل کو لوگوں نے بچا لیا۔''

تاج دین نے کانپتے ہاتھوں سے اپنا اوور کوٹ اتارنے کی کوشش کی اور ہم سب نے دیکھا اس کی سفید قمیض پر خون کا بڑا سا دھبہ تھا۔ اتنا زندہ اتنا تازہ جیسے خون اس کے دل سے رس رس کر کپڑے میں جذب ہو رہا ہو۔

اس نے اپنے خون آلود سینے کو بچی بانہوں کے حلقے میں لپیٹ لیا اور پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر رونے لگا۔

"میری رانی کو کسی نے نہیں بچایا' یہ میری لالی کا خون ہے۔"

"پاگل گدھے تو نے اپنی معصوم بیٹی کو قتل کر دیا۔ لے جاؤ حوالات میں۔ بند کر دو اس کو..... " جبار دھاڑا تو تاج دین کی چیخیں یک لخت رک گئیں۔ اس نے معصوم حیرت سے جبار کی طرف دیکھا اور سپاہیوں کے ساتھ باہر چلا گیا۔

جبار نے جھلا کر ڈیپ پروید سوئی اس زور سے رگڑ کر جلائی کہ میرا دل پٹاخے کی طرح دھڑکا اور مجھے لگا کہ کمرے کا سناٹا شیشے کی مانند تڑخ گیا ہے۔

تب ہوٹل کا کلکتی چھوکرا خالی پیالیاں اٹھانے کمرے میں آ گیا۔ میں نے معمول کے مطابق پانچ پیسے چائے کے اور پانچ پیسے ٹپ کے اس کی ٹرے میں آہستہ سے رکھ دیئے۔ چھوکرا روز کی طرح میرے بجائے جبار کو سلام کرتا باہر چلا گیا۔

"یار تم نے آج پھر چائے کے پیسے دے دیئے۔ ہوٹل والا میرے حساب میں لکھ لیتا۔" جبار نے روز کی طرح شکایت آمیز لہجے میں کہا لیکن میں جو اس موقعے پر روزانہ ہی بڑ بڑ مسکراتا تھا اور دل میں "چل چھوٹے" کہتا تھا آج نہ مسکرا سکا نہ دل میں کچھ کہہ سکا۔ میں نے اپنی نوٹ بک کے ان بہت سے صفحات کو ایک ایک کر کے اٹا جن پر میں نے تاج دین کا بیان جوں کا توں لکھ لیا تھا۔ لیکن جنہیں میرے قلم سے چند سطروں کی خبر میں ڈھلنا تھا۔

پھوار

وہ بھی جاڑوں کی ایک شام تھی اس دن گہرے دھوئیں جیسے بادلوں سے پھوار کی موہوم سے ننھے قطرے گر رہی تھی یہ پھوار پرانی متروک کوٹھی کی پکی چھت اور صحن میں بے آواز طریقے پر گرتی رہی اور جذب ہوتی گئی۔ لیکن پرانے انداز کے لمبے سے سرخ برآمدے کی کائی لگی منڈیروں اور کگروں پر یہی پھوار گرتی تو سست سست کر بوندیں بن جاتیں اور پھر نیچے پھیلے ہوئے پانی کے ننھے ننھے گڑھوں میں ٹپ سے گر جاتیں کبھی کو فرخندہ خانم کرسی پر بیٹھی ایم اے نفسیات کے آخری سال کا آزمائشی پرچہ حل کر رہی تھیں لیکن دن کا سارا وجود برآمدے کے ماتھے پر سے ٹپکتی ہوئی پانی کی بوندوں میں جیسے نہا رہا تھا ان کا خیال تھا کہ سردی میں صاف ہوا سے دماغ تر و تازہ ہو جاتا ہے اس لیے کوئی حرج نہیں کہ جسم پرانے کوٹ میں ٹھٹھر تا رہے لیکن دماغ نفسیاتی داؤ پیچ سمیٹنے کے لیے آمادہ ہو سکے۔

ٹپ ٹپ۔ پانی کی بوندیں فرخندہ خانم کے لیے گھڑی کی ٹک ٹک بن گئیں۔ جس سے انہیں وقت گزرنے کا احساس ہو رہا تھا تب ہی لمبے سے برآمدے کے دوسرے سرے پر کوٹھی کے آخری کمرے سے ایک ادھیڑ شخص ربڑ کی چپل گھسیٹتا باہر نکلا۔ فرخندہ خانم نے نیچی نظروں سے دیکھا اس کے بال احتیاط سے جمے ہوئے تھے اور عینک کے شیشوں کے پیچھے محتاط آنکھیں دور کچھ دیکھ رہی تھیں گیلی شام کے اس سے وہ شخص فرخندہ خانم کو ایک دم ٹوٹ کر اچھا لگا۔ مگر فرخندہ خانم جس طرح بیٹھی قلم چلا رہی تھیں چلاتی رہیں انہیں دیہاتی مارنا خوب آتا تھا یہ جبی صاحب ریاضی کے لیکچرار عبادالرحمن تھے جو صوبے کے ایک دور دراز کے کالج میں ملازم تھے ان کے ہاتھ میں ریاضی کی ایک کتاب تھی جو وہ پڑھتے پڑھتے تھک چکے تھے وہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے یہاں آئے تھے تاکہ یونیورسٹی کے کچھ پروفیسروں سے مشورہ کر سکیں بے حد محتاط پڑوسی کی طرح برآمدے میں خط تقسیم کے طور پر رکھے ہوئے گملوں کے اس پار انہوں نے ایک نظر ڈالی جہاں فرخندہ خانم بیٹھی نفسیات کا پرچہ حل کر رہی تھیں جب عبادالرحمن کے لیے اس کا چھوٹا سا ماموں زاد بھائی چائے کی ایک پیالی تھما گیا تو عبادالرحمن کو خیال آیا کوئی حرج نہیں اگر وہ اس بیچاری طالب علم لڑکی کو چائے کے لیے پوچھے۔

عبادالرحمن کے لیے کتاب پر جھکا ہوا ابر آلود ٹکڑا اور جڑی ان کے شاگرد کی حیثیت اختیار کر لیتا تھا فرخندہ خانم نے انکھیوں سے دیکھ کر مضبوط بے جھجک قدموں سے چل کر وہ گملوں کی دیوار تک آ گیا۔

''آپ نے چائے پی کہ نہیں۔

عبدالرحمن سنجیدہ اور متفکری آواز میں پوچھا۔

''ابھی نہیں۔

فرخندہ خانم نے بغیر چونکے آہستہ سے سر اٹھا کر عبدالرحمن کے بڑھے ہوئے ہاتھ کی طرف دیکھ جس میں چائے کی پیالی تھی پھر اس کے چہرے کی طرف جس میں ایک عجیب سادگی اور خوبصورتی تھی۔

''پھر یہ آپ پی لیجیے۔'' عبدالرحمن نے کہا۔''

اور فرخندہ خانم نے ہاتھ بڑھا کر پیالی یوں لے لی جیسے واقعی چائے پر اس کا حق فائق ہو۔ دونوں کی انگلیاں چھو گئیں فرخندہ خانم نے اپنی آنکھیں جھکا کر چائے پینا شروع کر دی۔ لیکن فرخندہ خانم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کی بڑی بڑی آنکھیں سانولے چہرے پر بری نہیں لگتیں لیکن جھک کر یہ کوئی خاص تاثر پیدا نہ کر سکتی تھیں کیونکہ ان کی پلکیں کچھ چھدری ورگری ہوئی سی تھیں فرخندہ خانم نے فوراً ہی اپنی آنکھیں اٹھا لیں۔

''امتحان پاس کرنے کے لیے پڑھنا بہت بورنگ (Boring) ہے۔'' عبدالرحمن نے جیسے چپ چاپ سے کہا ''نہیں کچھ ایسا زیادہ بورنگ بھی نہیں بلکہ کسی مقصد کو حاصل کرنے کو تیاری میرے خیال میں دلچسپ ہوتا ہے۔'' فرخندہ خانم نے ذرا اعتماد سے کہا پھر جلدی جلدی چائے کے گھونٹ اتارنے لگیں۔

موضوع گفتگو ختم ہو گیا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے برآمدے کے کائی لگے ماتھے سے ٹپ ٹپ کر کے پانی کے قطرے ایک ہی سر میں نیچے گر رہے تھے لیکن ان کی آواز میں فرخندہ خانم کو سرگم کے سارے سر سنائی دیتے۔ سڑک پر سے چھم چھم کرتا کوئی تانگہ گزرا۔ فرخندہ خانم کو ایسا لگا جیسے کوئی لڑکی گھنگھرو باندھے کہیں ناچ رہی ہو۔ سامنے لگے درخت پر ایک کوا پھڑ پھڑ کر پتوں میں ڈوب گیا۔ فرخندہ خانم کو پتوں کی سرسراہٹ بڑی بھلی معلوم ہوئی۔

پھر دور نالے کے پاس جھپر تلے جالو مائی کے تندور سے سوکھے پتوں کا نیلا دھواں پھوار کی موہوم سی چادر کو چیرتا ہوا مینار کی طرح اوپر بڑھنے لگا فرخندہ جیسے اسی نیلے دھوئیں میں لپٹی اوپر اٹھتی گئیں۔

پھر فرخندہ خانم کی پیالی کی چائے ختم ہو گئی اور خالی پیالی کو تھامے فرخندہ خانم نے ایک لمحے کو سوچا کہ اب کیا کریں پھر انہوں نے وہ پیالی عبدالرحمن کی طرف بڑھا دی۔

جاڑوں کی اس بھیگی بھیگی شام کی یہ مختصری خاموش سی کہانی دوسرے دن ہی انجام کو پہنچ گئی۔ جب عبادالرحمٰن کی ممانی پہلی بار گلیوں کی حد بندی پھلانگ کر فرخندہ خانم کے ہاں پہنچیں اور عبادالرحمٰن کے لیے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے فرخندہ خانم کا رشتہ مانگ لیا۔ فرخندہ خانم نے سنا تو جیسے تڑتڑا کر ان کے سر پر بجلی گری۔ اتنی بڑی بات اور پھر چند لمحوں میں انجام پا گئی۔ جب فرخندہ خانم کو ہوش آیا تو وہ اپنے گھر کے میلے دھندلے آئینے کے سامنے بڑی دیر تک کھڑی رہیں انہیں ایک دم پتہ چلا کہ وہ سب لڑکے جو یونیورسٹی میں ان کے ساتھ پڑھتے تھے محض ان کے حسن سے مرعوب ہو کر دور دور رہتے تھے امتحان کے ختم ہوتے سے پہلے فرخندہ خانم بیگم عبادالرحمٰن بن گئیں۔ یہ سب اتنی جلدی اور اتنی سادگی سے ہوا کہ فرخندہ خانم کو اپنی اکلوتی عزیز سہیلی کی طرح یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ شادی ہو رہی ہے گو عبادالرحمٰن نے صاف کہہ دیا تھا کہ شادی سادگی سے ہونی چاہیے۔ پھر بھی سب دھوم دھڑکے کی کمی محسوس کر رہے تھے۔

شادی کی رات کو فرخندہ خانم کا رواں رواں قوت سماعت سے لبریز تھا وہ سننا چاہتی تھیں کہ تم بڑی حسین ہو میں پہلی نظر میں تمہیں دل دے بیٹھا میں تمہارے حصول کی خاطر اپنی جان بھی دے سکتا تھا۔

آخر عبادالرحمٰن نے بولنا شروع کیا۔

''ہم دو چار دن یہاں اور رہیں گے آپ کو اگر ممانی سے کوئی تکلیف پہنچے تو محسوس نہ کیجئے گا۔''

''کیوں؟'' فرخندہ خانم نے پلکیں اٹھا کر پوچھا۔

وہ مجھ سے اور آپ سے دل میں ضرور ناراض ہوں گی میں نے ان کی بیٹی کو نظر انداز کر کے آپ سے شادی کی ہے نا''

عبادالرحمٰن نے آہستہ سے بتایا۔

فرخندہ خانم کا دھڑکتا ہوا دل جیسے رک گیا انہوں نے غور سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور پھر جیسے ان کا تمام جسم ایک تھرتھراتے کان کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔

''کیوں؟'' فرخندہ خانم کے تپتے ہوئے حلق سے جانے کیسے یہ لفظ نکل سکا ان کا سارا جسم شرمانے اور مسرت سے پھٹ پڑنے کو تڑپنے لگا۔

اب وہ کہیں گے میں تم پر دیکھتے ہی مر مٹا۔ ہائے کیسی شرم کی بات ہے۔ مگر عبادالرحمٰن نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ میں نے شمسہ کو اس لیے نظر انداز کیا کہ وہ ناپختہ ذہن کی لڑکی تھی۔ میں مرد اور عورت کے تعلق کو عقلی نقطہ نظر سے دیکھتا ہوں فطری طور پر عورت کو مرد کی اور مرد کو عورت کی ضرورت ہوتی ہے اس سلسلے میں شعر پڑھتے چاند اور پھولوں کے مکالمے بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ ایک سمجھدار

عورت ایسی بے عقلی کی باتوں سے کیسے خوش ہو سکتی ہے۔ ہے نا؟"

عبدالرحمن حرف "ہ" کر کہہ کر خاموش ہو گئے۔

آپ نے پھر۔ مجھے۔ مجھے کیوں۔ فرخندہ خانم یہ سوال پیش کرنا چاہتی تھیں لیکن الفاظ ان کے قابو میں نہ تھے۔

"تم میں جو اعتماد اور سادگی تھی اس نے مجھے متاثر کیا۔" عبادالرحمن نے مسکراتے ہوئے کہا اور فرخندہ خانم کو لگا آنکھیں اور چہرے کتنا جھوٹ بولتے ہیں۔

"تم کون تھیں اور کیا تھیں مجھے تمہارے ماضی سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ آئندہ ہوگی تم مجھے اس لئے اچھی لگیں یہ لو میرے یہ ہم ہے فرخندہ خانم۔" عبدالرحمن نے کہا اور فرخندہ خانم نے یوں محسوس کیا کہ عبدالرحمن نے میرے وجود کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں اس کا آدھا حصہ اس کے ماضی کو لیے ہوئے ستارے کی طرح افق میں گر کر کھو گیا اور اس نئی ادھوری شکل میں جیسے وہ دوبارہ پیدا ہوئی۔

"اگر میں آپ کو قبول نہ کرتی تو کیا ہوتا۔" فرخندہ خانم جیسے ٹوٹا ستارہ ڈھونڈنے لگیں۔

"شاید مجھے تھوڑا افسوس ہوتا۔ مگر یہ سوچ کر خوشی بھی ہوتی کہ تم اپنی رائے پر عمل کرنے کی قوت بھی رکھتی ہو۔ میں زندگی بھر تمہیں احترام سے یاد کرتا۔" عبادالرحمن نے خلا میں آنکھیں ڈبو کر بڑے پیارے انداز سے کہا۔

"جی۔ جی۔" فرخندہ خانم نے اس طرح یہ الفاظ ادا کئے جیسے وہ عبادالرحمن کے ہاتھ پر بیعت کر رہی ہوں۔

وہ نفسیات کی طالب علم تھیں اور نفسیات کا علم محبت کی ساری معصومیت ساری نزاکت کو الجھے دھاگوں کا گچھا بنا ڈالتا ہے مگر یہ عجیب بات ہے کہ عورت ہر کتاب پڑھنے کے باوجود اس کتاب سے منحرف نہیں ہوتی جسے اس کی فطرت تحریر کرتی ہے اور جو دل کے محفوظ ترین طاق میں رکھی ہوتی ہے مگر فرخندہ خانم نے بڑے وثوق سے خود تعین دلایا کہ عبدالرحمن نے ان کو جس زاویے سے دریافت کیا ہے در حقیقت وہ ایسی ہی ہیں وہ دونوں بہت جلد ممانی کے گھر سے دور اپنا گھر بسانے چلے گئے۔

لیکن یہ عجیب بات تھی فرخندہ خانم دن بھر اپنا گھر بساتیں پھر بھی انہیں یوں لگتا کہ اس گھر سے اٹھ کر ان دونوں کو کہیں دور جانا ہے وہ ایم اے کر کے ملازمت ضرور کر لیتیں۔ اگر ان کے بچہ نہ ہونے والا ہوتا۔ کیونکہ عبادالرحمن ان لوگوں میں سے تھے جو عورت کو ہر کی چیز جانتے ہیں اور عورت کی معاشی آزادی کو ترقی کا پیلا زینہ سمجھتے ہیں۔ وہ فرخندہ خانم سے کبھی نہ کہتے کہ قمیص میں بٹن لگا دیجئے یا پانی کا گلاس دے دیجئے

یہ دوسری بات تھی کہ فرخندہ خانم دیوانگی کی حد تک گھر یلو بیوی ثابت ہوئیں اتنی کہ جب وہ عبادالرحمن کسی بے حد دقیق علمی مسئلے پر

بات کر رہے ہوتے تو انہیں یاد آتا۔ ارے بک شیلف پر آج جھاڑن مارا ہی نہیں کوئی آ جائے گا تو کیا کہے گا۔؟

جب عبادالرحمن کالج جانے کے لیے صاف ستھرے کپڑے پہن کر روانہ ہوتے تو فرخندہ خانم کے جسم میں حساس کنٹری کی ایک بجری دوڑ جاتی اس سے بچنے کے لیے وہ ساری کا پلو کمر میں کھونس کر ایک ایک چیز کی جھاڑ پونچھ شروع کر دیتیں اور ساتھ ساتھ چھوٹے سے ملازم لڑکے پر اتنا چلاتیں اتنا برستیں کہ ان کی معمولی سی شکل اور بگڑ جاتی۔ لیکن عبادالرحمن کی کالج سے واپسی سے قبل فرخندہ خانم منہ ہاتھ دھو کر انسان کی شکل بن جاتی سونے رنگ پر گہری عنابی لپ اسٹک سے وہ اپنے نچلے ہونٹ کو بڑی اچھی تراش دیتیں اور بڑی بڑی کالی آنکھوں کو کاجل کے حصار میں قید کر لیتیں انہیں اپنی گری گری سی پلکوں کو سنوارنے کے ذریعہ اٹھانا بھی آ گیا تھا۔

''کوئی خبر؟'' فرخندہ خانم مسکرا کر ہمیشہ دروازے پر ہی عبادالرحمن سے پوچھا کرتیں۔

''میں آ گیا ہوں۔'' عبادالرحمن ہمیشہ ہنس ہنس کر ایک ہی جواب دیتے اور عبادالرحمن کی شخصیت پھیل کر جیسے گھر کے ذرے ذرے پر چھا جاتی۔ فرخندہ خانم اس شخصیت کے سائے میں سمٹ کر بیٹھی رہ جاتیں۔

راتوں کو دونوں اپنی اپنی دلچسپی کی کتابیں پڑھتے پڑھتے تھک جاتے عبادالرحمن بڑے دلچسپ انداز سے اپنی باتیں شروع کر دیتے۔ اپنے کالج سٹاف کی باتیں طالب علموں کی حرکتیں اور فرخندہ خانم اسکی دلچسپی سے یہ باتیں سنتیں اور اس پر تبصرہ کرتیں جیسے وہ ہر بات اپنے سامنے ہوتی دیکھ رہی ہوں۔

عبادالرحمن کی کچھ مشکلیں بھی تھیں۔ مثلاً وہ جس گریڈ کا حقدار تھا اسے دینے میں خوامخواہ دیر کی جا رہی تھی کیونکہ پرنسپل صاحب کی وہ خوشامد نہیں کرتا تھا۔

''تو بھی آپ ملازمت چھوڑ دیں تو پتہ چلے گا انہیں ریاضی کے استاد ملتے کہاں ہیں'' فرخندہ خانم بڑے فخر سے کہتیں اور عبادالرحمن کو یہی مشکلیں اتنی مشکل نہ معلوم ہوتیں۔ عبادالرحمن کبھی کبھی اپنے لڑکپن کے قصے سناتے۔

''میں جب چھوٹا سا تھا تو کیا ہوا کہ پتنگ لوٹنے کوٹھے پر چڑھ گیا'' عبادالرحمن کہتے جاتے اور فرخندہ خانم اس کے پیچھے پیچھے جیسے تخیل میں ہاتھوں کا سایہ کیے گھومتی رہتیں۔

''ہائے تم پتنگ لوٹنے منڈیر پر کیوں چڑھے تھے اور جو خدانخواستہ گر جاتے۔'' فرخندہ خانم کو چوٹ کی کسک اپنے دل پر محسوس ہوتی اور عبادالرحمن لمبی سانس لیتے مسکراتے بہاؤ کے خلاف تیرتے اپنے ماضی کے اندھیرے تاریکیوں میں ڈوبتے ابھرتے کنواں کی طرف ہاتھ بڑھاتے تھے فرخندہ خانم کو کبھی کبھی حیرت ہوتی کہ عبادالرحمن اپنے ماضی کا ذکر اتنے مزے سے کیوں کرتے ہیں پھر وہ

سوچتیں شاید اس لیے کہ ان دونوں کو اپنی مشترکہ زندگی اتنی مکمل اور بھرپور لگتی کہ اس کے بارے میں بات بھی کیا ہو سکتی ہے۔

باتوں باتوں میں فرخندہ خانم عبادالرحمن کی گزشتہ زندگی سے اتنی واقف ہو گئیں جیسے وہ بچپن سے ان کے ساتھ ہی رہی ہوں جیسے وہ ان سے بڑی ہوں جیسے خود فرخندہ خانم نے ہمیشہ ان کی حفاظت کی ہو۔ بڑے ہونے کا یہ احساس اس حد تک بڑھا کہ وہ عبادالرحمن کو کالج جانے کے لیے رخصت کرتے وقت کہ کرتیں۔

"دیکھئے سائیکل سڑک کے کنارے چلائیے گا اور پرنسپل سے بحث نہ کیجئے گا۔"

راتوں کو فرخندہ خانم تھمے سے آنگن میں ستاروں کی مدھم روشنی میں سوتے ہوئے عبادالرحمن پر جھک جاتیں۔ ان کے گھنے ریشمی بالوں کو ہولے ہولے چھوتیں ان کا ہاتھ بے طور کہیں دبا ہوتا تو اسے اٹھا کر آرام سے رکھ دیتیں اور انہیں دیکھے جاتیں جب سوتے میں عبادالرحمن ان کی طرف سے کروٹ بدل لیتے تو فرخندہ خانم کے دل کا گداز تنہائی کے احساس تلے دب جاتا۔

اندھیری رات میں فرخندہ خانم کو کتوں کے بھونکنے سے موت کا خیال آتا۔ چھوٹی چھوٹی دیواروں پر چوروں کے جھانکتے ہوئے سروں کا وہم ہوتا۔ پیٹ میں آنے والی زندگی کی حرکت سے تو وہ لرز جاتیں۔ انہیں بچے کو جنم دینے کے خیال سے ڈر معلوم ہوتا فرخندہ کا جی چاہتا کہ عبادالرحمن کو ان کے یہ سارے وہم یہ وسوسے اور خوف معلوم ہو جائیں۔ لیکن پھر ڈر جاتیں کہ عبادالرحمن انہیں کیا سمجھیں گے کتنے شرم کی بات ہے کہ وہ اور عام عورت کی طرح سمجھی جائے۔ کاش کبھی عبادالرحمن کے سامنے وہ اپنے بچپن کا ذکر کرتیں اس بچپن کا جہاں ان کے وسوسوں کی جڑیں تھی لیکن عبادالرحمن نے تو پہلے دن ہی فرخندہ خانم کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے اور یہ بات وہ بھول نہ سکی تھیں۔

یک دن فرخندہ کے سر میں درد تھا اور وہ دن بھر بستر پر یوں ہی اجڑی اجڑی سی پڑی رہیں۔

"میں تمہارے لپ اسٹک لگا دوں۔" عبادالرحمن نے اچانک ان سے پوچھا۔

"کیوں۔؟"

عبادالرحمن نے اس کیوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور اسپرو کا پیکٹ ڈھونڈھنے لگے فرخندہ خانم کے دل میں بدصورتی کا احساس سانپ کی طرح پھنکارنے لگا اور درد ٹپ ٹپ کر کے جیسے دکھ نچڑنے لگا۔

میں جانے کیا سوچا کرتی تھی جب کنواری تھی اتنے بہت سے خیالات تھے ایسے نرم جیسے دھنکی ہوئی روئی کے گالے۔" فرخندہ خانم نے کہنا شروع کر دیا اور پھر اپنی آنکھیں خلا میں ڈبو کر عبادالرحمن کے اس سوال کی منتظر رہیں کہ وہ کیا سوچتی تھیں فرخندہ خانم نے

خود بھی نہ بتایا کہ وہ کیا سوچا کرتی تھی۔ شاید دونوں ہی جانتے تھے کہ عورت کے تخیل کی اڑان کے آگے مرد کا ذہن گرد ہو جاتا ہے۔

پھر "منا" ان کے گھر آ گیا ان کی باتوں میں منے کی غوں غاں بھی شامل ہو گئی فرخندہ خانم کو اب آئینے کے سامنے جانے کی فرصت ہی نہ ہوتی شادی کے ایک سال کے اندر ہی وہ خود کو اتنا بڑا اور عقلمند سمجھنے لگی تھیں کہ اس بوجھ سے تھکی تھکی رہتیں۔ ہر دن ایک سا دن معلوم ہوتا اور ہر رات ایک سی رات۔ پھر یہ یکسانیت فرخندہ خانم پر برف کے گالوں کی طرح تہہ بہ تہہ گرنے لگی' گرتی چلی گئی ہر گزرا ہوا دن ان تہوں کے تلے دبتا گیا' چھپتا گیا اچانک فرخندہ کو اپنا ادھورا ایم اے یاد آیا اور وہ پڑھنے میں جٹ گئیں

رات گئے جب وہ پڑھ کر بستر پر لیٹتیں تو عبدالرحمن کو میٹھی نیند میں غرق دیکھتیں وہ انہیں رحم بھری نظروں سے دیکھتیں۔ جانے کیوں فرخندہ خانم کو یہ احساس ہوتا کہ ان کے اور عبدالرحمن کے درمیان کوئی ایسی شے ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھی۔

ہمدردی کے احساس سے مغلوب ہو کر وہ عبادالرحمن کو چھوتیں اور پھر یہ سوچتی ہوئی سو جاتیں کہ انہیں عبدالرحمن کا زیادہ خیال کرنا

چاہیے۔

دسمبر کی چھٹیاں ان دونوں کو اسی کوٹھی میں لے آئیں جہاں ان کی کہانی شروع ہو کر فوراً ختم ہو گئی تھی تو اب کہانی ختم ہونے کے بعد کیا چیز تھی جس کی کمی فرخندہ خانم کی رگ رگ میں بس گئی تھی۔

ابھی انہوں نے اکلوتی عزیز سہیلی کو بتایا تھا کہ وہ دنیا کی خوش قسمت ترین عورت ہیں اور ابھی ان کی سہیلی نے بھی اپنا دکھڑا رویا تھا کہ اس کا میاں نہ صرف حکومت کرتا ہے بلکہ شکی مزاج بھی ہے فرخندہ خانم آج بھی نفسیات کی کتاب لیے برآمدے میں بیٹھی تھیں گھٹنوں کی حد بندی اب میکے اور سسرال کی علامت تھی وہ اپنے میکے کی پرانی کرسی پر بیٹھی تھیں یہ عجیب اتفاق تھا کہ اس دن بھی خوب زور کی بارش ہو کر تھمی تھی بادل آسمان پر چھائے ہوئے تھے اور اب موہوم سی پھوار نرم نرم نہائی ہوئی مٹی میں جذب ہو رہی تھی۔

عبدالرحمن چھینکیں کھینچتے ہوئے ہمسائی والے آخری کمرے سے نکلے۔ فرخندہ خانم نے آنکھیں نہ اٹھائیں چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے ہوئے عبدالرحمن نے ان کی انگلی پکڑنا چاہی۔ مگر فرخندہ خانم کو ابکائی سی آ گئی۔

چھن چھن کرتا ہوا تانگہ سڑک پر سے گزر گیا۔ کوے درخت پر بسیرے کے لیے شور مچاتے رہے اور مائی جاتو نے وقت پر اپنا تنور گرم کرنا شروع کر دیا تو سوکھے پتوں کا دھواں مرغولے بن کر فضا میں مینار کی طرح بلند ہو گیا۔ مگر فرخندہ خانم وہیں کی وہیں بیٹھی تھیں ٹپ ٹپ ٹپ۔ کائی لگی منڈیروں اور گھروں سے پانی کے قطرے نیچے گڑھوں میں گر رہے تھے۔ تب ایک اسکوٹر کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہوا فرخندہ خانم نے آنے والوں کو نہیں دیکھا۔

اسکوٹر دیوار کی آڑ میں رک گیا۔

فرخندہ خانم یونہی خاموش بیٹھی رہیں۔

پھر برساتی میں بیٹھے ہوئے ایک شخص نے آگے آکر وقتی کارڈ انہیں پکڑا دیا جو کسی بچے کی سالگرہ کا بلاوا تھا۔

"یہ کون صاحب ہیں؟" فرخندہ خانم نے نام پڑھ کر پوچھا۔

"وہ آپ کو جانتے ہیں بریلی میں آپ کے گھر کے پاس رہتے تھے وہ خود ساتھ آئے ہیں۔ بلاؤں انہیں؟" اس شخص نے پوچھا

اور فرخندہ خانم کو وہ صاحب یاد آ گئے۔ سارا بوجھ جھٹک کر وہ گملوں کی حد بندی پھلانگتی اپنے سسرال والے حصے کی طرف ہو گئیں

اسکوٹر کی آواز سن کر باہر آتے ہوئے عبادالرحمن سے فرخندہ خانم ٹکرا گئیں۔

"میں نہیں جانتی وہ کون ہے بس کہہ دیجئے آ جائیں گے انہیں ٹال دیجئے۔ فرخندہ خانم نے نیلے تھراتے ہوئے ہونٹوں سے یہ

الفاظ بہ مشکل ادا کئے اور بستر پر ٹک گئیں۔

جب عبادالرحمن واپس اندر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ فرخندہ خانم آتشداں میں جلتی ہوئی آگ پر نظریں جمائے بیٹھی تھیں۔

"تم کس چیز سے ڈر گئی ہو تمہیں کیا ہوا۔" عبادالرحمن نے ان کا ہاتھ چھوا اور فرخندہ خانم ریت کی دیوار کی طرح بستر پر ڈھے گئیں

اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں عبادالرحمن نے پریشان ہو کر فرخندہ خانم کے جسم پر لحاف ڈال دیا اور فرخندہ خانم شدید سردی میں

کپکپانے لگیں۔

کیا دو بارہ سال کی کسی لڑکی کے پاؤں کوئی دھلا دے تو گناہ ہے؟" فرخندہ خانم نے کپکپاتی ہوئی ہذیانی آواز میں پوچھا

"نہیں تو" عبادالرحمن نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔

"اس زمانے میں مجھے ننگے پاؤں پھرنے میں مزہ آتا تھا ایک دن اس نے مجھ سے کہا آ۔ گندی لڑکی تیرے پاؤں دھلاؤں

مجھے بڑی گدگدی ہوئی۔ میں نے اسکے بال پکڑ لیے یہ کوئی گناہ تھا۔؟ فرخندہ خانم نے مدھم آواز میں جیسے اپنے آپ سے پوچھا۔

"پھر۔۔۔" عبادالرحمن نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"پھر میں بڑی ہوئی تو اس نے شادی کا پیغام بھیجا میری امی نے منع کر دی۔"

فرخندہ خانم نے تھرتھراتے ہوئے کہا۔

"تم ہاں کرنا چاہتی تھیں۔" عبادالرحمن نے جانے کیسے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم مگر اب وہ میرا پیچھا کیوں کر رہا ہے وہ کیوں آیا ہے؟ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔ وہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔" فرخندہ خانم نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور بے تحاشا رونے لگیں۔"

"وہ تمہیں کوئی بھول سکتا ہے فرو مجھے دیکھو ایک دفعہ تمہیں دیکھا تھا پھر کیا ہوا؟"

عبدالرحمن نے فرخندہ خانم کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں جھانک کر آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا اور فرخندہ خانم کی آنکھیں مندنے لگیں۔

"بیچارہ وہ کہاں سے تمہیں ڈھونڈنے آ پہنچا۔ تم ڈر کیوں گئیں؟ تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا کوئی بھی نہیں۔" عبدالرحمن نے کہا اور اپنی باہیں فرخندہ خانم پر پھیلا دیں۔

اور زندگی میں پہلی بار فرخندہ خانم نے اپنے آپ کو دنیا کے ہر خطرے سے محفوظ سمجھا پہلی مرتبہ وہ ان باہوں کے بوجھ تلے ننھی سی ضدی بچی کی طرح سسکتی ہوئی نرم نرم روئی کے گالوں جیسے پرلطف خواب میں ڈوب گئیں۔ عبدالرحمن کے منہ سے چند بول سننے کے لیے ہی جیسے وہ پچیس سال کی عجیب سی بے خوابی میں مبتلا تھیں انہیں یوں لگا جیسے عبدالرحمن کی باہیں لمبی ہوتی گئیں بہت لمبی یہاں تک کہ انہوں نے ساری کائنات کو اپنے حلقے میں لے لیا ہے۔

◆◆◆

شرف کا گنج

مِڈی مال کی ڈھلوانی سڑک کے کئی پھیرے لگانے کے بعد ہم دونوں ڈاک خانے کی بلند عمارت کے زینے پر دم لینے کو بیٹھ گئے۔ دریچی پر کہ ب تلے جا رہے تھے قریب ایک موٹی سی عورت مصنوعی پھول بیچنے والے سے قیمت پر جھگڑ رہی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ پنڈی میں ایسے پھول کہیں سستے ملتے ہیں۔ اس کے چار بچے آئسکریم والے کی گاڑی میں جھانک رہے تھے۔ اور اس کا شوہر قیمتی سوٹ پہنے بیوی بچوں سے بے خبر اس ننگی ٹانگوں والی عورت کو دیکھ رہا تھا جو سینما کے بڑے سے بورڈ پر چھائی ہوئی تھی جس کی ایک ٹانگ کے نیچے تلے سے گزر کر لوگ سینما کا ٹکٹ خریدنے کے لیے جا رہے تھے۔ میلے کپڑوں والا بوڑھا پانی میں نرگس اور گلاب کے پھول ڈالے قیمتی جوڑوں کا پیچھا کر رہا تھا۔ کیونکہ اس کے پھولوں کے خریدار یہی لوگ تھے۔ ڈاک خانے کی چھت پر پہاڑی کوؤں کی کائیں کائیں ہوٹل سے بلند ہونے والی بینڈ کی آواز میں اچانک دب گئیں۔ سڑک کے موڑ پر ابھری ہوئی بڑی سی کالی چٹان کی ایک درز سے پھوٹنے والے جنگلی گلاب یوں سڑک کی طرف جھک آئے تھے جیسے وہ بھی تماشہ دیکھ رہے ہوں۔ سڑک جس پر سے لوگ ایک دوسرے کو دیکھتے شناساؤں سے گپ شپ کرتے بڑھتی گھٹتی لہروں کی طرح متحرک تھے۔ وہی اتنے بہت سے اجنبی چہرے جو پہلے دن سے ہی یک اکتا دینے والی گونگی شناسائی میں ڈھل چکے تھے۔ پہاڑ کا حسن رنگین قیمتی کپڑوں اور ہوٹلوں سے نکلی ہوئی خوشبوؤں میں کہیں گم ہو گیا تھا۔

ہم دونوں جیسے روٹھ کر ادھر سے چلے اور اچانک پکی سڑک چھوڑ کر پتھریلی ڈھلانوں پر اتر آئے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اندھا دھند آگے ہی بڑھتے گئے۔ سیدھی سڑکیں فاصلے اور حسن کا احساس بخشتی ہیں۔ لیکن درختوں میں گھری ہوئی پھولوں سے سجی ہوئی پگڈنڈیوں سے گزرو تو جسم یوں ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے جیسے پر نکل آئے ہوں۔ ہم اپنی بلند آوازوں اور بے ساختہ ہنسی سے خود ہی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سمت، وقت، فاصلے کا احساس گم ہو چکا تھا۔ گلہریاں ہمارے شور سے گھبرا کر درختوں پر چڑھ جاتیں اور چڑیاں اپنے پرکھوں کر فضا میں تیر جاتیں اور اس عالم میں مجھے اپنے ہاتھ پر ان کے ہاتھ کی گرمی ایک عجیب سی حفاظت اور انوکھی سی بے لوث محبت کا احساس بخش رہی تھی۔ ہمیں خبر بھی نہ ہوئی کہ کب پیلی پڑتی دھوپ کو بادلوں نے اپنے آنچل میں سمیٹ لیا۔ خبر اس وقت ہوئی جب بارش اور اولوں نے آ لیا۔ ہم نے اپنے اردگرد کسی چھت، کسی مکان کا تو خیال ہی نہ رکھا تھا ہم دونوں ایک ہی برساتی اپنے سروں پر

پھیلائے ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے پیچھے ہی پیچھے اترتے گئے۔ قریب ہی کہیں ایک کتا اپنی خوفناک آواز میں بھونکا۔ کتا جو انساں کی موجودگی کی خبر دیتا ہے اور پھر دھواں دھار بارش کی لڑیوں کے پیچھے سے ایک ہیولا سا ہماری طرف بڑھا۔

"آ جاؤ۔ پیچھے پیچھے آ جاؤ۔ سنبھل کر اترو صاحب!"

بڑی بڑی مونچھیں بارش کے دھوئیں میں بھی نمایاں تھیں۔ ہم گرتے پڑتے پیچھے چل پڑے۔ درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑی ڈھلانوں پر بنے ہوئے گھر بڑے منکسر مزاج ہوتے ہیں۔ اپنا سر جھکائے رکھتے ہیں۔ ہم تو چھت کی پناہ گاہ کے کہیں قریب ہی تھے۔ چند ہی لمحوں کے بعد ہم بھاری بھر کم سرخ مخمل والے صوفوں اور ریلوے ویٹنگ روم جیسی جہازی سائز والی آرام کرسیوں سے سجے ہوئے کمرے میں تھے۔ ہماری اکلوتی برساتی سے پانی نچڑ کر قالین بھگو رہا تھا اس کی ہمیں خبر نہ ہوئی۔ بس ہم تو ایسے شریر بچوں کی طرح ہنس رہے تھے جو مار کھانے سے بچ گئے ہوں۔ اسی لمحے اندر کی طرف کھلنے والے دروازے کے سفید پردے کو حرکت ہوئی تو ہم دونوں جھجک کر قالین سے ہٹ کر لکڑی کے فرش پر آ گئے۔ بند کمرے میں بجھتے ہوئے انگاروں کی مہک کے ساتھ ایک بڑی مدھم شائستہ سی خوشبو شامل ہو گئی۔ باہر کتا مسلسل بھونک رہا تھا اور بارش بھی اسی زور شور سے ہو رہی تھی .... اس کے باوجود گھنگھروؤں کی ہلکی سی چھنک صاف سنائی دی..... اور پھر پردہ ہٹا کر دس بارہ سال کی ایک لڑکی پرانا کشمیری شال پہنے اندر جھانکی۔ اس کے ہاتھ میں تہہ کیا ہوا نیا تولیہ تھا۔

"خاتون کہتی ہیں آپ اندر آ جائیں بی بی صاحب!" اس نے اس طرح کہا جیسے وہ مجھے کوئی سزا سنا رہی ہو لیکن مجھے خاتون کے لفظ سے بھولی بسری انس لوی سی خوشبو پھوٹتی محسوس ہوئی۔ میرے شوہر نے میرا ہاتھ دبا کر مجھے روکنا چاہا۔

"شاید آپ کو بھی ایک پیالی چائے مل جائے۔ جاؤں؟" میں نے سرگوشی کی اور انہوں نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ نیم تاریک سی راہداری سے گزر کر لڑکی نے تو بے مجھے پکڑا کر غسل خانے کا دروازہ میرے لیے کھول دیا۔ بالکل وہی قصباتی ریلوے سٹیشن والا فرسٹ کلاس ویٹنگ روم کا غسل خانہ۔ اگر یہاں کوئی اضافہ تھا تو اونچی سی کھڑکی پر سفید جھالر والے سفید پردے کا اور کھونٹیوں پر لٹکے ہوئے بہت سے نیلے پیلے سرخ کپڑوں کا جن سے پسینے کی اور خوشبوؤں کی ملی جلی سی خوشگوار بو پھوٹ رہی تھی۔ میں نے دھندلے سے آئینے کے سامنے چہرہ خشک کرتے ہوئے سوچا۔ اگر چلتے وقت ساجد بھائی نے ہمیں زبردستی اپنی برساتی نہ تھما دی ہوتی تو کیا ہوتا۔ انہوں نے کہا تھا کہ پہاڑوں کی بارش اور دھوپ کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔

غسل خانے کے دروازے پر گھنگھروؤں والی جھنکی سن کر میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا وہی چھوٹی سی لڑکی ہاتھوں پر استری کیا ہوا

نیلے رنگ کا شلوار سوٹ پہنے کھڑی تھی جس میں سے وہی شائستہ سی خوشبو پھوٹ رہی تھی جس نے اس گھر میں داخلے کے وقت ہمارا استقبال کیا تھا۔

"خاتون کہتی ہیں آپ کے کپڑے بھیگ گئے ہیں یہ پہن لیجیے۔" لڑکی نے کہا۔

"نہیں شکریہ۔ ضرورت نہیں۔ تم مہربانی سے میرے صاحب کو تولیے دے دو۔ وہ جو باہر کمرے میں ہیں نا۔ انھیں۔" میں نے لڑکی کی طرف تولیہ بڑھایا۔

"خاتون کا حکم ہے کہ بی بی صاحب کی دیکھ بھال کل جان کرے اور صاحب کی دیکھ بھال بابا کرے۔ فکر نہ کیجیے۔" لڑکی نے چاندی کے گھنگھروؤں والی چوڑیوں سے بھرا ہوا ہاتھ اٹھا کر اپنے سر پر بوڑھیوں کی طرح شال درست کیا۔

"آپ ادھر بیٹھو یہیں بی بی صاحب' خاتون نے کہا ہے۔" لڑکی مجھے چھوٹے سے ہال میں چھوڑ کر بلی کی طرح چپکے سے غائب ہو گئی۔

لکڑی کی ڈھلواں چھت کے نیچے بیٹھ کر بارش کی تیز آواز یوں معلوم ہو رہی تھی جیسے کوئی چھت پر ٹیپ ڈانس کر رہا ہو۔ ہوا کے جھکڑوں میں شیشے کی بند کھڑکی پر درخت کی ایک ٹہنی بار بار جھک کر اندر جھانک رہی تھی۔ جھالروں والے سفید پردے ربن سے بندھے کھڑکی کی محراب کی شکل دے رہے تھے۔ یہاں بھی باہر والے کمرے جیسا فرنیچر تھا۔ اور اسی طرح صوفوں کی پشت پر اور ہتھوں پر نفیس کڑھت والے سفید کور پڑے تھے۔ جن میں پہاڑوں پر کھلنے والے سارے پھولوں کے رنگ جیسے کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ کھڑکی کی سل پر رکھا کشتی نما گل دان چیڑ کے خشک پھلوں اور سوکھی ٹہنیوں سے سجایا گیا تھا۔ اور اس کے قریب ہی انگریزی کا ایک زنانہ میگزین پڑا تھا جس پر ایک حسینہ نائٹ گاؤن میں ملبوس جیسے اڑنے کے لیے ہاتھ پھیلائے ہوئے تھی۔ کھڑکی سے بہت نیچے بہت گہرائی میں کسی سڑک پر کسی بس کا ہارن بے تابی سے چلانے لگا اور اسی وقت اچانک بجلی اس طرح چمکی کہ ہر شے سفید تر ہو گئی۔ اس کے بعد خوف ناک کڑک نے تو ہال ہی دہلا دیا۔ ایک خوف دوسرے خوف کو جنم دیتا ہے۔ سارا ماحول ایک دم مجھے بے حد پراسرار لگنے لگا گھر میں صرف ایک چھوٹی سی لڑکی جو کہ بلی کی طرح چلتی ہے اور باہر وہ خوفناک مونچھوں والا آدمی در پھر کتے کا مسلسل بھونکنا مجھے یوں لگا کہ اب ادھر ادھر کے دروازے دھڑ دھڑ کھلیں گے اور جانے کون کدھر سے برآمد ہوگا۔ آخر وہ خاتون کہاں ہیں جن کے حکم سے یہاں ہر کام چل رہا ہے۔

اچانک دروازے کے پیچھے گھنگھرو بجے اور میں نے گھبرا کر آواز دی۔

"لڑکی اے لڑکی! سنو! ادھر آؤ تم"

لڑکی پردہ ہٹا کر دبے پاؤں چلتی میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"تمہاری بیگم کہاں ہیں؟" میں نے اسی لہجے میں پوچھا۔

"وہ تو ادھر نہیں۔ وہ تو لاہور میں ہیں۔" لڑکی نے مجرموں کی طرح سر جھکا کر آہستہ سے کہا اور بلی کی طرح باہر کھسکنے لگی میں اس کے پیچھے لپک کر یہاں سے باہر نکل جاؤں لیکن اس سے پہلے کہ میں باہر جا کر انہیں اس پُراسرار روح کی کہانی سناتی۔ وہ میری راہ میں کھڑی نظر آئی۔ ایک بے حد مدھم اور شائستہ سی خوشبو میں بسی سفید پردے کی محراب کے درمیان وہ کچھ یوں کھڑی نظر آئی جیسے ایک خواب ہو۔ مکمل حسن کیا ہے؟ اس کے سانچے ہر ذہن میں ہر سرزمین پر مختلف ہو سکتے ہیں لیکن مجھے یوں لگا جیسے عورت کی خوبصورتی کی جو مکمل تصویر میرے ذہن میں تھی وہ میرے سامنے ہے۔ میں ساکت رہ گئی یقیناً اسے میرے چہرے کے تاثرات کا اندازہ ہو گیا اس لیے اس نے مجھے ہوش میں آنے کا موقع دیا اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی وہ میری طرف بڑھی اس کا سفید جالی کا لمبا مصری سپ دوپٹہ دونوں شانوں پر سے ہوتا ہوا آبشار کے جھاگ کی طرح اس کی ایڑیوں کے آس پاس مچل رہا تھا۔ اپنا خوبصورت ہاتھ پھیلا کے وہ اس صوفے کی طرف دیکھنے لگی جس پر وہ مجھے بٹھانا چاہ رہی تھی۔

"میں خاتون ہوں۔ خاتون شرف خان۔" اس نے اپنا تعارف یوں کرایا جیسے کسی خفیہ خزانے کا پتہ بتا رہی ہو۔

میں نے اپنے نام کا پہلا ٹکڑا ادا کیا اور رک گئی۔ مجھے اپنی آواز اس کے سامنے بڑی کھردری اور گستاخانہ سنائی دی۔ لیکن اس نے مدھم سر میں میرے نام کا دوسرا ٹکڑا مجھے عطا کر دیا اور شاید وہ میری حیرانی کو سمجھ گئی

"بارش سے پہلے میں آپ دونوں کو اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھ رہی تھی۔ میں بھی آپ دونوں شاید یونٹی کے طالب علم ہیں جو مال کی رونق چھوڑ کر یہاں پھر رہے ہیں۔ پھر میں نے سوچا کہ آپ دونوں جلدی ہی شادی کر ڈالیں گے۔ میں نے آپ کی شادی کی تصویر اخبار میں دیکھی ہے نا۔" وہ رک رک کر بولنے لگی اور میں اسے دیکھتی رہی اور اس اتفاق کا لطف لیتی رہی کہ وہ مجھے پہچان گئی۔

"آپ دونوں میں ذہنی ہم آہنگی ہے یہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ آپ دونوں یہاں آ کر ہر چیز سے ایک جیسی دلچسپی لے رہے ہیں مجھے بڑا اچھا لگ رہا ہے۔ عام طور پر ایسا ہوتا نہیں! اکثر شادیاں۔ خیر آپ تو خود ہی باتیں جانتی ہوں گی۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر خود کلامی کے سے انداز میں بول رہی تھی۔ میں نے اس کی گنگناتی نرم آواز کے بہاؤ میں اپنے الفاظ کا بند باندھنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لیے ہوں ہاں کرتے ہوئے بس اسے دیکھتی رہی۔

"ہم لوگ ہر سال یہاں آ جاتے ہیں گرمیوں میں۔ میرے پاپا نے یہ کاٹیج ایک انگریز سے خریدی تھی۔ مجھے یہاں آ کر بہت اچھا لگتا ہے۔ جیسے میں کسی اور دنیا میں پہنچ جاتی ہوں۔ اس کھڑکی کے باہر بھی سب کچھ کتنا رومینٹک ہے نا۔" اس نے میری طرف داد طلب نظروں سے دیکھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"نہ جانے لوگ یہاں آ کر مال پر گھومنا کیوں پسند کرتے ہیں؟ میں تو بالکل نہیں جاتی۔ اب دیکھئے میرے گھر کے سارے لوگ وہاں گھومنے گئے ہوئے ہیں۔ روز جاتے ہیں۔ ممی تو آج کل چڑی گئی ہوئی ہیں، میری خالہ بیمار ہو گئی ہیں نا ..... ورنہ وہ بھی خریداری کے بہانے سب کے ساتھ جاتی ہیں۔" یہ سب کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک دبی دبی سی حیرانی تھی۔

"اور آپ، یہیں رہ جاتی ہیں" مجھے بولنا ہی پڑا۔

"ارے یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ اتنی خوبصورتی میں گھر کر انسان اکیلا کہاں رہتا ہے؟ پھر پاپا بھی تو ہیں گھر میں۔ کئی سال پہلے ان کی ریڑھ کی ہڈی پر چوٹ لگ گئی تھی۔ نچلا دھڑ مفلوج ہو گیا۔ بس وہ کتابیں پڑھتے ہیں یا کھڑکی سے باہر دیکھتے رہتے ہیں .... مجھے بھی کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔" اس نے اٹھارویں انیسویں صدی کے کئی ناول گنوا دیے۔

"ایک بات کہوں۔" اس نے لمبی سانس لے کر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

"ضرور" میں نے جیسے سرگوشی کی۔

"مجھے آج کے لکھنے والے اتنے پسند نہیں۔" میرا مطلب ہے کہ ان کے کرداروں میں کوئی مثالی کردار نہیں ہوتا۔ نہ سچی محبت نہ قربانی کا جذبہ۔" اس نے یوں آنکھیں جھپکائیں جیسے قصور خود اس کا ہو۔

میں صوفے سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آ گئی۔ میرا جی چاہا اس سے کہوں، یہ مشکل دور ہے اور مشینیں بڑی اکھل کھری اور بے جذباتی ہوتی ہیں۔ مگر میں اس سے کچھ نہ کہہ سکی۔ کہا تو بس اتنا کہا کہ آپ ٹھیک کہتی ہیں۔

وہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

"میرا جی چاہتا ہے کہ ایک ناول لکھوں، مگر مجھے اعتماد نہیں اپنے قلم پر۔ پھر لوگ کہیں گے پرانے طرز کی چیز ہے۔"

"نہیں۔ آپ ضرور لکھئے۔" میں نے بڑے یقین سے کہا۔ "آپ لکھ سکتی ہیں۔"

"میرا جی چاہتا ہے کہ تصویر بھی بناؤں۔ مگر دیکھئے نا اب سیدھی سادی تصویریں بھی تو نہیں بنتیں اور پھر شاید میں تصویریں بنا بھی نہیں سکتی۔ کبھی فطرت کے حسن پر پیار آتا ہے تو . پھر کشیدہ کاری کر لیتی ہوں۔ مجھے پھولوں سے بہت محبت ہے، ننھے ننھے

پھولوں سے۔" وہ بول رہی تھی تو میں اپنے سامنے رکھے ہوئے کشتی نما گلدان کو چھو رہی تھی جس میں کوئی پھول نہ تھا۔ بس چیڑ کا ایک خشک پھل اور چند خشک ٹہنیاں

"میں پھول توڑتی نہیں توڑتی۔ یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے کسی کو قتل کر دیا جائے۔" اس نے میری انگلیوں کی سو یہ حرکت کا جواب دیا۔

"پھول تو اپنی جڑوں کے اوپر بھی مرجھا جاتے ہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں مگر مرجھاتے ہوئے اپنے بیج تو زمین کے سپرد کر دیتے ہیں۔ آپ دیکھئے ان پہاڑوں کا کوئی مالی نہیں مگر ہر طرف پھول ہی پھول ہیں۔" اس نے اس طرح کہا جیسے پھول اس کا بہت ہی ذاتی معاملہ ہوں۔

چھوٹی لڑکی اپنی چوڑیوں کے گھنگھرو چھنکاتی چائے کی ٹرے لیے اندر آئی اور ہم دونوں صوفے کی طرف لوٹ آئے۔

لکڑی کی چھت پر بارش اپنا ناچ ختم کر چکی ہے اس کا احساس مجھے چائے کا پہلا گھونٹ پیتے ہوئے ہوسکا۔

دھواں دھواں سے پہاڑوں کے پیچھے ڈوبتے ہوئے سورج کا عکس اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا۔ اس نے اپنی پیالی کو ہونٹوں سے چھوا تو یوں لگا اس طرح جیسے پیالی سے کچھ کہہ رہی ہو۔

کہیں اندر سے ایک بچے کے رونے کی آواز آئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے میری آنکھوں میں سوال پڑھ لیا۔

"میری سب سے چھوٹی بہن کا بچہ ہے۔" اس نے اپنے مخصوص انداز میں آہستہ سے اطلاع دی۔ میں پھر بھی اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"آپ کو میرے آئیڈیل کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ میں صرف دولت اور سماجی رتبے والے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔ اس لیے چھوٹی بہنوں کو بٹھائے رکھنا کوئی اچھی بات تو نہ ہوتی .. . میں نے ممی کو بتا دیا تھا۔ . ہم تینوں بہنوں کی عمروں میں ڈیڑھ ڈیڑھ سال کا فرق ہے۔ یوں بھی ہمارے ہاں لڑکیوں کی شادی جلدی کر دی جاتی ہے۔"

چھوٹی لڑکی کمرے میں آ گئی۔ اسکی انگلی پکڑے دو سال کا ایک خوبصورت بچہ ساتھ تھا۔

"خاتون بی بی صاحب کو "صاحب" بلاتے ہیں۔" لڑکی نے اطلاع دی۔

میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ حالانکہ میرا ابھی جی چاہ رہا تھا کہ بیٹھی رہوں۔ وہ میرے ساتھ بڑے شاہانہ انداز سے اٹھی اس کے شانوں پر سے بہتا ہوا غیر معمولی لمبا دوپٹا اس کی ایڑیوں پر چھلکنے لگا۔ اس نے اپنا نرم گرم ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

"جب یہاں آئیے تو مجھ سے ملنا نہ بھولیے گا . . آئندہ سال جب آپ آئیں گی تو آپ کی گود میں میرے بھانجے جیسا

خوبصورت بچہ ہوگا۔" اس نے اپنے اسی مدھم سے لہجے میں مجھے خوش خبری سنائی اور میں نے جھینپتے ہوئے بات ٹالنے کو کہا۔

"آپ میرے شوہر سے نہیں ملیں گی؟"

"ہمارے ہاں کنواری لڑکیاں پردے کی پابندی کرتی ہیں۔" اس نے ذرا فخر کے ساتھ کہا۔

نیم تاریک راہداری سے گزرتے ہوئے میں نے مڑ کر اسے دیکھا۔ مجھے خیال آیا کہ مجھے اس سے ضرور کچھ کہنا چاہیے۔ لوگ خوبصورت درختوں' تاریخی عمارتوں پر بنا لکھ جاتے ہیں۔

"ایک بات کہوں؟" میں نے مڑ کر اس سے ذرا بلند آواز میں کہا۔ وہ خاموشی سے میرے ساتھ مردانے کمرے کے دروازے تک آ کر رک گئی۔

"آپ بہت خوبصورت ہیں بہت۔" میں نے سوچا کہ وہ عام عورتوں کی طرح اپنی تعریف سن کر ہنسے گی اترائے گی' شرمائے گی۔ کچھ نہیں تو کھلکھلا کر ہنسنے لگے گی لیکن اس کی کافی کی رنگت والی آنکھوں نے کوئی تاثر نہ بدلا۔ اس کی گھنی پلکیں مور کے پروں کی طرح چہروں پر چھائی رہیں۔ ہاں ہونٹوں کے بائیں گوشے اور رخسار کے سنگم پر ایک موہوم سا بھنور بنا اور مٹ گیا۔

ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے پتھریلے رستوں پر چڑھتے ہوئے ہم نے اوپر تک مڑ کر دیکھا۔ خاتون اپنے کمرے کی کھلی کھڑکی میں تھی۔ شام کے دھندلکے میں اس کا لرزتا ہوا دوپٹہ اڑتی فاختہ کے پروں جیسا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنے شوہر کے سامنے خاتون کے حسن کی تصویر کھینچنے کے لیے الفاظ کے اتنے رنگ بکھیرے کہ انہیں کہنا پڑا۔

"ارے تم کیسی عورت ہو۔ بالکل بے وقوف۔ کوئی دوسری عورت کی تعریف بھی یوں کرتا ہے؟ عورتیں تو دوسری عورت کے پکائے ہوئے کھانے تک کی تعریف نہیں کرتی شوہر کے سامنے۔"

"میں ..... میں تو بس ایسی ہوں۔ میں نے تو جو کچھ زندگی بھر میں دیکھا ہے' جو کچھ محسوس کیا ہے.... . جو دیکھوں گی' جو محسوس کروں گی اس میں آپ کو حصے دار بنائے رکھنا چاہتی ہوں۔ یہ مرد اور عورت کہاں بیچ میں آ گئے۔"

نو سال بعد ہم دوبارہ ڈاک خانے کی عورت کے پاس دم لینے کو رکے تھے۔ ہماری دونوں بچیاں ماں کے میکے میں تتلیوں کی طرح اڑتے اڑتے تھک گئی تھیں۔ مری میں یہاں پہلا دن تھا۔ اچانک ہم دونوں جیسے ایک خاموش معاہدے میں بندھے وہاں سے چلے اور پکی سڑک چھوڑ کر پتھریلی پگڈنڈیوں پر اتر گئے۔ سب کچھ نو سال پہلے کی طرح نہیں تھا۔ ڈھلانوں میں کچھ گھر نئے بن گئے تھے کچھ بن رہے تھے۔ ہم پگڈنڈیوں پر پھولوں کو کچلنے سے بچاتے درختوں کو چھوتے آگے ہی آگے اترتے گئے۔ ہماری بچیاں اس

تجربے سے خوش ہو کر دور درو سے ہنس رہی تھیں۔ کہیں کتے کے بھونکنے کی آواز آئی تو میں نے اپنے ہاتھ پر ان کے ہاتھ کا گرم دباؤ محسوس کیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بغیر کچھ کہے سنے ہوئے بچوں کو سنبھالے تھامے سمتیں بدل بدل کر خاتون کی کاٹیج تلاش کرنے لگے۔

آخر ہم نوکروں کے کوارٹروں کی دیوار تک پہنچے تو اس کی اوٹ میں "شرف کاٹیج" موجود تھی۔

بڑی بڑی سیاہ مونچھوں میں دو ایک سفید بال چمک رہے تھے۔

"شرف خاں صاحب سے ملنا ہے۔" میرے شوہر نے کہا۔

"وہ اللہ کو پیارا ہوا۔" جواب ملا۔

"تم تو گل جان کے بابا خان ہو نا؟" میں نے پگڈنڈی سے اترتے ہوئے پوچھا۔

"گل جان کا شادی ہوا کراچی گیا۔" جواب ملا۔

اور وہ ہمیں اس کمرے میں چھوڑ گیا۔ سب کچھ اسی طرح تھا۔ ایک ادھیڑ عمر ریچھ نما موٹے صاحب نے ہمارا استقبال کیا۔ چند لمحے بعد اندرونی دروازے پر ایک گدبدے سے جسم والی گوری چٹی ہنستی ہوئی کم عمر بیگم نے اندر قدم رکھا۔ میں نے اپنا نام بتایا تو اس نے بڑی بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے بچوں کے ساتھ اندر جاتے ہوئے مڑ کر شوہر کو دیکھا جو ان پہاڑ نما صاحب کے ساتھ بیٹھے بڑے مظلوم سے نظر آ رہے تھے۔

نیم تاریک راہداری سے گزرتے ہوئے وہ بول رہی تھی۔ "میں آپ کا نام کیسے نہ جانتی' خاتون پی آپ کا بہت تذکرہ کرتی ہیں ... تشریف رکھیے آپ خاتون پی کی سہیلی ہیں' میں آپ کو بھی "پی" کہوں گی... " اس نے گرم جوشی سے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ آپی کا "الف" اڑا گئی۔

اندرونی ہال میں سب کچھ تقریباً اسی طرح تھا۔ بارش میں دس پندرہ منٹ کی اتفاقیہ ملاقات نے خاتون کو میرے اتنے قریب کر دیا کہ اس کی بہن مجھے سہیلی کہہ رہی تھی۔ مجھے اپنی ذات کے بارے میں زبردست خوش فہمی ہونے لگی۔

"بچیاں بڑی پیاری ہیں آپ کی۔ نام بتایئے اپنا۔ شاباش بتایئے تو بھلا؟" یہ مرحلہ بھی میری مدد سے طے ہوا۔

"بڑے سنے سے نام ہیں۔ خاتون پی سنیں گی تو خوش ہو جائیں گی۔ خاتون پی نے آپ کی کتابیں لاہور سے منگوائی تھیں گھر میں سب کو پڑھوائیں۔ مجھے بھی کسی زمانے میں لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ مگر اتنی جلدی شادی ہو گئی میری۔ پڑھنے کا وقت ہی نہیں ملا۔

دماغ میں جیسے بھوسہ بھر گیا۔ "وہ شرمندگی سے ہنسنے لگی۔

"گھر اور بچے مشکل ہی سے فرصت دیتے ہیں۔" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر میرے تو کوئی بچہ نہیں۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"ہو جائے گا۔" میں اس کی بے تکلفی اور بے ساختگی پر ہنسنے لگی۔

"کوئی آسمان سے ٹپکے گا۔ آپ تو جانتی ہوں گی سارا الزام بیوی پر آتا ہے۔ مگر میں ان کی پہلی بیوی جیسی سیدھی نہیں جو اس کی طرح جاگیر میں منہ چھپائے بیٹھی رہتی میں جی کے ساتھ علاج کے لیے امریکہ گئی، وہاں پتہ چلا۔۔۔۔ میاں جی آپ ہی۔ علاج ہیں۔ اب یوں میرے اشاروں پر ناچتے ہیں۔" اس نے اپنی انگلی لہرائی اور یوں ہنسی جیسے کھیل میں جیت گئی ہو۔ مجھے اس بھاری بھرکم ریچھ نما شخص کے ناچنے کے تصور پر ہنسی آ گئی۔

پھر وہ بتاتی رہی کہ میاں جی کی جاگیر میں سے کیا کچھ اس کے نام لکھا جا چکا ہے اس کی مسلسل باتوں کے درمیان میری آنکھیں بار بار راہداری کے دروازے کی طرف اٹھ جاتیں۔ میں خاتون کی منتظر تھی۔ اس نے میری نظریں پکڑ لیں اور وہ ہنستی ہوئی پھدکتی اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہنسی کی پھلجھڑیاں چھوڑتی اندر آئی تو اس کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر عورت ٹرے میں بسکٹ دال موٹھ قسم کی چیزیں لیے اندر آ گئی۔

"چائے ابھی آتی ہے۔" اس نے کہا۔

"اور خاتون؟" میرے صبر کا بند ٹوٹ گیا۔

"ارے میں نے آپ کو پہلے نہیں بتایا؟ خاتون "پی" ایک بار گھر سے نکلیں تو کب لوٹیں گی کون بتا سکتا ہے۔ انہیں میری طرح موٹا ہونا پسند نہیں۔ آپ تو نہیں جانتی ہیں۔" وہ پھر کھلکھلائی۔

مگر مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا۔

"خاتون کی شادی ہو گئی؟" میں نے پوچھا تو ہنسی کی پھلجھڑیاں ایک دم بجھ گئیں۔

"خاتون پی نے آپ کو نہیں بتایا تھا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ نو سال پہلے پندرہ بیس منٹ کی ملاقات میں خاتون نے اپنے بارے میں اتنی بہت ساری باتیں اتنے سحر انگیز طریقے پر بتا ڈالی تھیں۔ اب خدا جانے اس کی بہن کس بات کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

"ان کی ہمارے چچا زاد بھائی سے منگنی ہوئی تھی۔ بہت محبت تھی دونوں میں۔ تب وہ سولہ سال کی تھیں۔ آنے والی عید میں شادی مقرر ہوئی تھی' مگر پھر خاتون بی بیمار ہو گئیں۔ معلوم ہوا ان کے اندر ٹیومر ہے۔ بڑا آپریشن ہوا۔ مشکل سے جان بچی۔ اب دیکھئے ناہر کوئی شادی کے بعد گھر میں بچے دیکھنا چاہتا ہے' اس لیے منگنی ٹوٹ گئی۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ جلدی جلدی پلیٹوں میں چیزیں نکال کر ہمیں پیش کرنے لگی۔ مگر میں جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

"شاید راستے میں آپ کو وہ مل جائیں' مگر آپ پہچانیں گی نہیں۔ ایک دم بدل گئی ہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ بار مونز۔" وہ تفصیل سے بتانے لگی مگر میں نے کچھ نہ سنا۔

واپسی پر میرے شوہر نے خاتون کے لیے کچھ نہیں پوچھا اور نہ میں نے بتایا۔ میں تو اپنی بچیوں کے بارے میں فکر مند تھی۔ انہوں نے میرا ہاتھ تھامنا چاہا تو میں نے غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"ارے ذرا چھوٹی کو اٹھا لیجئے' اتنی چڑھائی ہے' کہیں پھسل نہ جائے۔" میں نے اپنی بڑی بچی کا ہاتھ مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا۔ اس وقت میرے شوہر پلٹ کر "شرف کاٹیج" کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ... میں چڑھائی پر ہانپتے ہوئے یک دم ہنس پڑی تو وہ بھی میرا ساتھ دینے لگے۔

ڈاک خانے کے پہلو سے گزرتے ہوئے میری نظر ابھری ہوئی سیاہ چٹان پر رکی جس کی ایک دراڑ سے گلاب کی پھولوں بھری جھاڑی بدستور جھکی ہوئی تھی' لیکن اب اس کے نیچے سیاہ برقعے میں لپٹی ایک عورت کھڑی تھی میں نے اسے پہچانا' مگر میں نے اپنے شوہر کو نہیں بتایا۔ "شرف کاٹیج" کی خاتون کو میں اپنے شوہر کے تصور میں آخر کیوں جوں کا توں زندہ رکھنا چاہتی تھی؟

◆◆◆

ایک اور نعرہ

خادم اس تاریخی موقعے پر یہاں حاضر ہے۔ سب تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں میدان تماشائیوں سے بھر چکا ہے لیکن ملاحظہ ہو لوگ ابھی تک جوق در جوق چلے آ رہے ہیں ارد گرد کی بستیوں سے دور دور کی آبادیوں سے مخلوق خدا پیدل گاڑیوں' چھکڑوں' ٹرکوں اور بسوں میں لد لد کر یہاں پہنچ رہی ہے۔ کیا جوش و خروش ہے۔ کیا جذبہ ہے۔ دیکھیے اب نئے آنے والے بسوں کی چھتوں پر چڑھ رہے ہیں۔ لیجیے کچھ لوگ درختوں پر چڑھ گئے وہ ارد گرد کے گھروں کی چھتوں پر بھی رنگوں کی بہار ہے۔ بچے' بوڑھے جوان' عورتیں' لڑکیاں بالیاں اور گود کے بچے بھی تو موجود ہیں۔ بالکل میلے کا سماں ہے۔ یوں بھی چھٹی کا دن ہے۔ زیادہ تر لوگ دھلے دھلائے کپڑے پہن کر آئے ہیں۔ میدان میں عورتوں کے لیے الگ جگہ مخصوص کر دی گئی ہے اور یہ جگہ بھی بھر چکی ہے۔ لیجیے بعض معتبر لوگ اس طرف اشارہ کر کے کچھ کہہ رہے ہیں۔ چلیے معلوم کرتے ہیں۔ ان حضرات کو عورتوں کی موجودگی پر اعتراض ہے۔ صاحب! یہ اعتراض بے موقع ہے۔ آخر عورتوں کو بھی عبرت حاصل کرنے کا حق ہے۔ ویسے بھی عورت ہی اس جھگڑے میں فساد کی جڑ ہے۔ دیکھیے! میدان پر ایک طائرانہ نظر ڈالیے' انسانوں کے ہلکورے لیتے' بڑھتے' پھیلتے اس دائرے میں ایک قوس نیلے' پیلے' سرخ' ہرے اور یہ وہ سفید رنگ جھلکا رہی ہے۔ وہ جو کہا گیا ہے کہ

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

کوئی حد تو نہیں۔ چوڑیاں بج رہی ہیں۔ چہرے چمک رہے ہیں۔ ہونٹ مسکرا رہے ہیں۔ حضرات گھر بچے رو رہے ہیں۔ غالباً لاؤڈ اسپیکر سے ذکر رو رہے ہوں گے۔ مجرم کی فردِ جرم سنائی جا رہی ہے نا۔ آہ کیا شرمناک فردِ جرم ہے۔ میدان کے بیچوں بیچ کھڑی ٹکٹکی پر مجرم موجود ہے۔ پاجامہ اس کی بندھی ہوئی پنڈلیوں پر الجھا پڑا ہے اور کمر سے رانوں تک سفید کپڑا لپٹا ہوا ہے۔ کم بخت کی تانبے جیسی پیٹھ پر سورج چمک رہا ہے۔ دیکھیے۔ دیکھیے! اب کچھ لوگ مجمع میں سے اچھل اچھل کر لعنت بھیج رہے ہیں مجرم پر۔ مگر کچھ لوگ اپنے ساتھ لائی ہوئی پوٹلیوں اور برتن کھول کھول کر ایک دوسرے کو روٹیاں اور پراٹھے تقسیم کر رہے ہیں۔ پتہ نہیں رات کس وقت یہ لوگ یہاں پہنچنے کے لیے گھروں سے چلے ہوں گے۔ اب اطمینان سے بیٹھے تو بھوک لگ آئی بے چاروں کو۔ وہ جو کہا ہے کسی نے پیٹ بڑا بدذات ہے بابا۔ ٹھیک ہے کچھ مجھ سے کہا اماں جی؟ آ گئیں۔ اچھا اچھا اماں جی نہیں بہن جی۔ ہاں بہن جی کیا بتانا چاہتی ہیں

آپ؟ آپ مجرم کی محلے دار ہیں؟ آپ کو معلوم ہے کہ یہ بڑا اتہکار بندہ ہے۔ محلے کی کئی لڑکیوں کو پہلے بھی بہکا چکا ہے؟ آپ کے خیال میں اسے سب کے سامنے اور ذلیل کرنا چاہیے یعنی کہ۔ اوہ اماں جی۔ تسلی میری بہن جی۔ اتنا کھڑا تو رہنا ہی چاہیے۔ بیٹھ جائیے اپنی جگہ پر ہاں ہاں آپ کی یہ تجویز اوپر پہنچا دیں گے۔ بیٹھ جائیے۔ آہا۔ ہماری خواتین بھی ایسے گنہگاروں سے کتنی نفرت کرتی ہیں یہ اماں جی اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

ہاں تو اب آگے چلتے ہیں۔ واہ واہ! یہاں تو مجرم کے خلاف غیظ و غضب کا عجب عالم ہے۔ یہ دراصل ٹکٹکی کے گرد کا حلقہ ہے۔ میرا مطلب ہے وی۔ آئی۔ پی (V.I.P) حلقہ کی طرف سے کس قدر غصے اور نفرت کا اظہار ہو رہا ہے۔ لوگ اس طرح مٹھیاں ہوا میں اچھال رہے ہیں کہ اگر ان مٹھیوں میں کنکر ہوتے تو مجرم ٹکٹکی پر بندھا بندھا بھوسہ ہو کر میدان میں بکھر جاتا۔ ویسے جناب یہ شدت جائز ہے۔ یہ سب چاچن کے عزیز رشتے دار اور برادری والے ہیں اب دیکھیے نا اس بدبخت مجرم نے ٹکٹکی پر بندھتے ہوئے کسی پشیمانی کا اظہار تک نہیں کیا تھا۔ ابھی جو چاچن کے رشتے دار اس پر تھوک رہے تھے اس بے حیا نے جوابا ان کو گن گن کر گالیاں دیں۔ خاص طور پر چاچن کے معزز بوڑھے خاوند چودھری کو ... سخت بیہودگی تھی مجرم کی دیکھیے دیکھیے۔ مجرم سر گھما گھما کر مجمع کو کیسے تماشائی انداز سے دیکھ رہا ہے۔ ہنس رہا ہے مردود!

ارے ارے ٹھہریے حضرات۔ یہ آپ لوگ کیا چھینا جھپٹی کر رہے ہیں مجھ سے۔ آپ جو کہنا چاہتے ہیں مجھے بتائیے وہ میں کہہ دوں گا۔ ہائیں؟ کیا کہا۔ دوسری ٹکٹکی بھی میدان میں کھڑی کی جانا چاہیے؟" مگر کیوں صاحب زادے؟ کس کے بھائی جان؟ اس کی ساتھی مجرمہ کے لیے' آپ کا مطالبہ ہے کہ دونوں نے مل کر گناہ کیا مل کر سزا بھگتیں تاکہ عورتوں کو بھی کچھ عبرت حاصل ہو۔ ہاہاہا۔ اچھا خیال ہے مگر دیکھیے عورت ذات کو چادر اور چار دیواری کی حدود میں سزا ملنا چاہیے۔ بیٹھ جائیے اپنی جگہ پر آپ کا مطالبہ اوپر پہنچا دیں گے۔

دیکھیے کمانڈو آ رہے ہیں۔ شش اس میں دھر لیے جائیں گے آپ حضرات بیٹھ جائیے۔

اُف! کیا مطالبہ ہے۔ ذرا تصور فرمایئے اگر دو ٹکٹکیاں یہاں کھڑی ہوتیں تو کیا ہوتا۔ عدالت میں تو وہ بے غیرت ماتھے سے ناک تک کالی چادر میں لپٹی آئی تھی۔ پوری چاندنی آنکھوں میں رچائے ہاتھوں میں بسائے شاید ان پرجوش نوجوانوں نے بھی اسے اتنا ہی دیکھا ہوگا جتنا میں نے۔ باقی بدن میں کیسی چاندنی ہوگی؟ لاحول ولا   کیسے بیہودہ لوگ ہیں۔ تھو!

بچیے حضرات فرد جرم تمام ہوئی۔ اوہ۔ دیکھیے

سارے مجمعے میں طوفانی لہریں سی پیدا ہو گئی ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں ہاتھوں میں ہیں کہ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ آ گیا میدان میں وہ جوان۔ ننگے سیاہ بدن پر سفید جانگیہ کیا خوب کنٹراسٹ پیدا کر رہا ہے۔ بالوں بھری مضبوط چھاتی اور ٹانگیں بوٹی بوٹی قوت کے ابال سے پھڑک رہی ہے نچلے ہونٹ کو اس طرح دانتوں سے دبائے ہے کہ لمبی لمبی گھنی مونچھیں تھرتھرا رہی ہیں۔ جسم پر تیل چپڑ ہے۔ دھوپ میں لشکارے مار رہا ہے۔ کیا پھرتی۔ کیا چلت پھرت ہے صاحب۔ کام شروع کرنے سے پہلے کیسے فن کارانہ پینترے بدل رہا ہے۔ واہ دیکھئے دیکھئے کیسے سلوموشن SLOW MOTION میں گھوڑے کی طرح دوڑ رہا ہے۔ مجمع کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ حضرات! سنئے! اس سناٹے میں اس کا کوڑا اس طرح سنسنی سی بجا رہا ہے جیسے سوراخ میں داخل ہوتی آندھی۔ اور۔ یہ پڑا پہلا۔ دیکھئے دیکھئے۔ ٹکٹکی پر بندھے کم بخت کی بوٹی بوٹی پھڑکی اور ایک لمبی چیخ گونجی۔

تیری خاطر کوڑے کھائیں گے

ہائے ہائے۔ یہ تالیاں۔ حد ہے بھئی۔ تالیاں غلطی سے بج گئیں اور آپ اس بدکردار مجرم کے نعرے پر کان نہ دھریئے۔ حضرات اس پرجوش ہجوم کی پرمسرت چیخیں سنئے۔ جو سراپا پرجوش ہو رہا ہے۔ تالیاں بھی اسی لے پہ بجا رہا ہے۔ دیکھئے دیکھئے ہر کوڑے پر لعنت کا ایک نعرہ۔ اب آپ گنتی گنئے۔ رقص جرم و سزا دیکھئے۔ اتنی دیر میں ایک سگریٹ سلگا لوں۔ صاحب بہت شور ہو تو انسان کے اعصاب جواب دے جاتے ہیں۔ خیر۔ ملاحظہ ہو ہر کوڑے پر کوڑے والے کو کیسی بھرپور داد مل رہی ہے۔ خصوصاً ٹکٹکی کے ارد گرد سے۔ کچھ لوگ اچھل رہے ہیں۔ کچھ محویت کے عالم میں اپنے ہاتھوں خود کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ ہنس رہے ہیں۔ مگر زیادہ لوگ سر جھکائے ہوئے ہیں۔ شاید کمزور دل ہیں۔ بے رو رہے ہیں غباروں والے غبارے رگڑ رگڑ کر بچوں کو بہلا رہے ہیں۔ دھنکی ہوئی رنگین روئی جیسی شکر کی مٹھائی والے اپنی گھنٹیاں بجا رہے ہیں۔ میٹھی بانسریوں والے بوتلیں ٹکرا کر ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ کیا بات ہے۔ کیا ہم آہنگی ہے۔ ارے بھلا یہ آدمی کیوں میری طرف پاگلوں کی طرح ہاتھ کے اشارے کر رہا ہے۔ اور اس کی کمر سے چپٹا ہوا لڑکا کیوں رو رو کر بے حال ہوا جا رہا ہے۔ کانپ رہا ہے اس کے پاس چلتے ہیں۔ ہاں تو بھائی میرے آپ لڑکے کو میٹھی بوتل کیوں نہیں پلا دیتے؟ نہیں پتا! خیر پھر آپ اپنے تاثرات بتایئے اس سزا پر۔ ارے تاثرات نہیں جانتے۔ اخبارات نہیں پڑھتے؟ ریڈیو نہیں سنتے؟ ٹی۔ وی بھی نہیں دیکھتے۔ کمال ہے ارے ان سب میں عوام کے تاثرات ہی تاثرات ہوتے ہیں ہر اصلاحی اقدام پر۔ یعنی آپ صرف یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کو آپ کے بیٹے کے ساتھ یہاں سے باہر نکال لے چلوں مگر ایسی بھی کیا جلدی؟ اچھا آپ ایک کمرے میں اپنی بیوی بچوں اور ماں کے ساتھ رہتے ہیں۔ ارے تو اس وقت اسے بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے میرے بھائی؟ ہمارے پاک وطن میں بے شمار لوگ اسی طرح رہتے ہیں۔ اس کا لڑکے کے رونے کا نچے سے کیا تعلق ہے میاں؟ آپ ٹھیک

کہہ رہے ہیں بھائی کہ انسان خطا کا پتلا ہے۔ اس نے ماں باپ کا کہنا دیکھ لیا تھا کبھی۔ ایسا ہوتا ہے بھائی مگر رہے یہ کہتا ہے کہ آپ کو کوڑے لگیں گے یہاں؟ ہاہاہا۔ بڑا بے وقوف لڑکا ہے آپ کا بیٹا جائے میرا راستہ چھوڑ دیجئے۔ اچھا ادھر والا لڑکا تو خاصا بڑا ہے۔ مونچھیں پھوٹ رہی ہیں۔ کس قدر نڈر ہو کر ٹکٹکی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس کے تاثرات معلوم کرتے ہیں۔ کیوں بھئی لڑکے۔ یہ سب کیسا لگ رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ ''تمہیں سب معلوم ہے؟ ایسا ہونا چاہیے ٹھیک ہو رہا ہے! واہ واہ شاباش نیک لڑکے کیا کہا تم نے یعنی تمہارے خیال میں کافی مار نہیں پڑ رہی۔ یہ تم کیسے کہہ رہے ہو؟ یعنی تم کہہ رہے ہو کہ کوڑے مارنے والا تمہارے بابا کے مقابلے میں پھسڈی ہے۔ تمہارا بابا تمہاری سوتیلی ماں کو مارتا ہے تو دو دو منٹوں میں کمر پیٹھ پر لال کر دیتا ہے۔ اوہ .. ارے رے لڑکے تم اچھلے کیوں لگے۔ تالیاں کیوں پیٹنے لگے .. اوہو 'لڑکا یونہی نہیں خوش ہو رہا۔ واقعی ٹکٹکی پر بندھے مجرم کے سفید کپڑے پر خون کی دھاریاں ابھر آئی ہیں۔ ۔ آخ ۔ ''اور اب میں یہ کن بے حجاب لڑکوں کے گروہ میں گھر گیا۔ لاحول ولا ۔ دونوں ہاتھوں کو توڑ موڑ کر کیسے ننگے اشارے فضا میں اچھال رہے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں بزرگو ۔ آپ ہی منع کیجئے حضرت... تو آپ کے خیال میں منع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ نسل غلط تعلیم و تربیت فلم اور وی۔ سی۔ آر کی پروردہ ہے۔ ٹھیک ہے آپ کا کہنا۔ اچھا اب اسی نسل سے پوچھتے ہیں۔ ہاں تو پیارے لڑکو 'کہاں سے آئے ہو۔ کہاں ہے تمہارا گاؤں۔ یہ تو دور ہے۔ اچھا 'پھر بیل گاڑی میں بٹھا کر بھیجا ہے تمہارے مالک نے۔ تمہارا مالک ممبر بنے گا۔ کیا کہہ رہے ہو۔ بہت لوگ ٹرک میں بھی آئے ہیں تمہارے ساتھ۔ ۔ اچھا تو رات بھر چل کر پہنچے ہو۔

ارے بچے ادھر ایک اور کوڑا پڑا اور یہ نئی نسل چابی بھرے کھلونے کی طرح وہی حرکتیں کرنے لگی ۔ ۔ ۔ لاحول ولا ۔ شرم نہیں آتی۔ اتنے اتنے سے لونڈوں کو۔ آخر اسی گروہ کے قریب سے ہی رنگوں کی قوس بننا شروع ہو جاتی۔ کچھ حیادار دیہاتی ٹکٹکی بھول کر آگے بڑھتے اور چادریں اپنے گرد لپیٹنے لگیں۔ کچھ بڑھیا کھا جانے والی نظروں سے لڑکوں کو دیکھ رہی ہیں۔ مگر زیادہ تر خواتین ٹکٹکی کی طرف متوجہ ہیں۔ کچھ آنسو پونچھ رہی ہیں۔ کچھ ہر کوڑے پر منہ چھپا کر یوں جھک جاتی ہیں جیسے کوڑا ان کی پیٹھ پر پڑا ہو۔ کچھ عورتیں ہر کوڑے پر زور زور سے چیخ رہی ہیں۔ کچھ آواز سے رو رو کر بین کر رہی تھیں کچھ پتھر کے بتوں کی طرح ایک دوسرے سے چمٹی بیٹھی ہیں۔ بھنس رہی ہیں۔ چلیے انہی سے سزا کے بارے میں تاثرات معلوم کرتے ہیں وہ لپٹی ہوئی عورتوں سے یک تاثر مل ہی جائے گا۔ ہاں تو محترم بی بیو' کیا خیال ہے اس سزا کے بارے میں... ؟ ارے ارے بزرگوار ارے بھائی آپ دونوں مجھے کیوں گھسیٹ رہے ہیں۔ میں تو ان کے تاثرات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ہائیں۔ آپ کے خیال میں عورتوں کے کوئی تاثرات نہیں ہوتے۔ مگر دیکھئے کتنی عورتیں بین کر رہی ہیں۔ میئے میئے کہہ رہی ہیں کیا انہونی کی بے چارے نے۔ ... چاتن تو اس کی بچپن کی منگیتر تھی۔ یہ کہہ رہی ہیں کچھ عورتیں۔ ؟! آپ کے لیے ناقابل توجہ ہیں یہ باتیں۔ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں۔ ٹھیک ہے ان کے آنسو تو

پلکوں پر دھرے رہتے ہیں۔ بہت خوش ہوں تب بھی روتی ہیں۔ بے شک آپ بہت تجربہ کار ہیں بزرگوار   اب اس سلسلے میں
اپنے تاثرات سے آگاہ کیجئے   اچھا تو آپ کا خیال ہے کہ عورت کو ہر طرف سے دبا کر رکھنا چاہیے۔ اس پر بھروسہ بھی نہیں کرنا
چاہیے۔ بہت خوب' آپ کے یہ صاحب زادے سمندر پار نوکری کرتے ہیں۔ اللہ نے بہت دیا ہے۔ ٹکل کے اور دلہن ہوتی تو
ثقافت دوسری بہو بھی بیاہ لاتے۔ اچھا کیا بزرگوار' نسل چلانا تو ضروری ہے۔ چلیے کوئی بات نہیں۔ انتظار کیجئے کبھی اللہ دس پندرہ سال
کے انتظار کے بعد بھی اولاد سے نواز دیتا ہے۔   اچھا تو آپ کے یہ صاحب زادے دو سال میں ایک بار چھٹی آتے
ہیں۔   ان کی عدم موجودگی میں آپ بہوؤں کے دروازے میں اپنی چارپائی اڑا کر سوتے ہیں۔ اچھا طریقہ ہے ایسے میں بھلا
آپ کی عزت کی طرف کوئی آنکھ اٹھا سکتا ہے۔ بہت خوب۔ بہت خوب اچھا تو صاحب زادے آپ کے والد صاحب عورت کو دبا کر
رکھنے کی بات کر رہے تھے۔ خوب! آپ بھی متفق ہیں۔ آپ کے خیال میں بیویوں کے ساتھ انصاف کرو۔ خوب اوڑھاؤ پہناؤ تو دو
کی جگہ چار بھی ہوں تو وہ بھی ویسی ہی محبت سے ساتھ رہتی ہیں۔ جیسے آپ کی دو بیویاں رہتی ہیں۔ اچھا آپ نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ
آپس میں محبت سے نہ رہیں تو تمہاری صورتیں نہیں دیکھوں گا۔ واہ خوب دھمکی تھی۔ پھر اچھا تو دونوں میں محبت کی حد ہے۔ دونوں ایک
دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ آپ سے بالکل نہیں جھگڑتیں۔ بہت خوب بیویوں میں محبت پیدا کرنا بھی کوئی معمولی بات نہیں۔ داد
دیتا ہوں۔

اور یہ جو ہم رنگ برقعوں میں دو بیبیاں سر جوڑے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے گم صم بیٹھی ہیں۔ کہیں آپ کے گھر والیاں تو نہیں
. قابل تعریف ہیں آپ۔

اے بی بی میری آستین چھوڑیئے۔ جو کہنا ہے کہیے۔ اچھا تو آپ جانن کو جانتی ہیں برسوں سے۔ مجرم کی شمشیرے کی منگ تھی
جانن۔ ہاں ہاں معلوم ہے عدالت میں اس کا ذکر سنا تھا۔ ادھر عورتیں بھی یہی کہہ رہی ہیں۔ اور کیا کہنا ہے بہن جلدی کہیے۔ اچھا تو یہ
مجرم اپنی کمائی یار دوستوں میں اڑا دیتا تھا۔ اس کی ماں بہت شور مچاتی تھی؟ بچانا چاہیے تھا۔ اور آپ کہتی ہیں مجرم میں اور کوئی عیب نہ
تھا۔ چھوٹی یہ بھی کرگا تا بہت شاندار تھا۔ مگر بہن یہ بھی سوچیے گانے سے ماں کا پیٹ تو نہیں بھر سکتا   تو آپ مانتی ہیں کہ اسی
سے جانن چودھری کی بیوی پر سوکن بنا دی گئی۔ چلیے چھٹی ہوئی۔   اچھا اور کہیے بی بی۔   گویا آپ کی کہانی بھی جانن
جیسی ہے آپ بھی دوسری جگہ بیاہ دی گئی تھیں۔ خوب۔ خوب' آپ جانن کو سمجھاتی تھیں سب اچھا برا۔ مگر وہ کچھ نہ بھی اور بھاگ گئی۔
ارے بھئی بی بی آپ ایسے کیوں رو رہی ہیں بچوں کی طرح   آپ کو بہت پیار ہے جانن سے۔ نہیں؟ تو پھر کیوں رو رہی ہیں۔
سب کے سامنے۔ کچھ بتائیے ہم تاثرات جمع کر رہے ہیں۔ آنسو پونچھ لیجئے بتائیے .   جانن بھاگ گئی اور آپ نہ بھاگ سکیں؟
یہ کیا کہہ گئی بھئی۔ ارے ارے وہ بی بی تو پگلوں کی طرح جنگلے کے پاس جانے کی کوشش کر رہی ہے   خیر اسے روکنا محافظوں کا

کام ہے   خود ہی روک لیں گے۔

پیچھے نعرے ختم گئے۔ فحش اشارے کرتے ہاتھ تھک گئے۔ عورتیں رو رہی ہیں۔ بچے اور زیادہ گلا پھاڑ رہے ہیں۔ مجرم کا ستر پوش خون میں تر ہے۔ اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا ہے۔ وہ دیکھئے۔ ڈاکٹر صاحب گٹھڑی کی طرف جا رہے ہیں گنتی ابھی پوری نہیں ہوئی۔ جناب مجمع بہت زیادہ ہے۔ اب زیادہ لوگوں کے تاثرات آپ تک نہ پہنچا سکوں گا   یہ کام میرا ساتھی انجام دے گا۔ اس خادم کو تو خون دیکھ کر چکر آنے لگا ہے۔ بہتر ہے اب گھر کا راستہ پکڑیں۔

ے اے لڑکے یہ تو میرے پیچھے اپنی سوٹی کیوں لہرا رہا ہے۔ لکاؤں ایک تھپڑ آگے چل اچھا تو چر رہا ہے۔ اندر تماشہ دیکھنے گیا تھا کم بخت باہر جو تیرا ریوڑ تتر بتر ہو جاتا ہے۔ چل بھاگ جلدی سے۔ ابھی بھیڑ نکلے گی تو بکریاں سرمہ بن جائیں گی ... . شاباش یوں بھاگے ہیں..... . ارے کیا کہنا کیا غضب کی خوب صورت ہے یہ سفید بکری قدرت خدا کی کھروں میں تو لگتا ہے کالے "فل بوٹ" پہنے ہیں۔ اور گلے میں تو کالی ٹائی سی بندھی ہے۔ واہ واہ۔ کیوں میں چر رہا ہے۔ یہ بکری بیچو گے۔ میرے بچے کھیلیں گے اس سے کتنے میں بیچو گا۔ کیوں بھلا؟

"ہائیں۔ .. .. کیا کہا؟ یہ تیری چاہت ہے۔ یہ تیری جان ہے۔ ..... اور...... اور تو تو اس کی خاطر کوڑے کھائے گا...... ؟

ٹھہر تو مردود

ارے! یہ تو کوڑے والے کے اسٹال میں دوڑ گا رہا ہے۔ اور یا خدا ... .. بکری کے کتنے نازک جسم اس کی سوٹی کی زد میں ہیں۔؟ یا خدا یہ نعرے بھی کتنی تیزی سے سفر کرتے ہیں۔

◆◆◆

ایک کہانی بڑی پرانی

بڈھے نوکر نے دروازے میں سے سر نکال کر پھر کچھ کہنا چاہا۔

"اُفوہ ابھی بہت سن لیں تمہاری باتیں۔ میرا دماغ نہ کھاؤ۔ میرے گھر رہنا ہے تو جیسا میں کہوں ویسا کرنا ہوگا ورنہ ۔ "

دروازہ بند ہوتے دیکھ کر وہ چپ ہو گئیں۔ ان کے ہاتھ لرز رہے تھے غصے سے یا شاید سردی سے۔ کھڑکی کے شیشوں پر سے پرانی ساری سے بنا ہوا پردہ بھی ہٹا ہوا تھا۔ پھر بھی کہر کے مارے ہوئے سورج کی روشنی میں کمرہ اندھیرا لگ رہا تھا۔ انہوں نے پلاسٹک کی سلائیوں پر اون کے پھندوں کو آنکھوں کے قریب لا کر گننا شروع کیا۔

"بیگم صاحب۔" بڈھے نوکر نے کمرے کا دروازہ پھر کھولا۔ اور اندر آ گیا۔ اب اس کے ہاتھ میں چادر میں بندھی گٹھری تھی۔

"پھر جانے کی دھمکی دے رہے ہو بخشو میاں۔ تم سمجھتے ہو میرے ہاتھوں میں دم نہیں ۔ پھر تم ہو کس کام کے؟ جیسا پکاتے ہو خوب معلوم ہے۔ میں نہ دیکھوں تو بھلا کوئی پیٹ بھر کر کھا سکتا ہے۔ بازار سے سودا سلف لا دیا اور بچوں کو سکول سے لے آئے تو سمجھتے ہو گھر کے سارے کام ختم ہو گئے۔ سارا دن تو میں ہی مرتی کھپتی ہوں گھر کے کاموں میں واہ اچھی دھمکیاں ہیں جانے کی۔"

دھپ سے گٹھری فرش پر پھینک کر بخشو میاں اکڑوں بیٹھ گئے اور گٹھری کی گرہ کھول دی۔

"لو دیکھ لو کچھ لے کر نہیں جا رہے تمہارے گھر سے۔ بعد میں نہ کہنا

"بس بس دیکھ لیا ۔ ہاں یہ سویٹر رکھ دو میں نے بنا بُن کر تمہیں دیا تھا۔ تمہیں ہماری پروا نہیں تو ہمیں بھی نہیں۔ اب جو یہاں کام کرے گا وہ پہنے گا سے اتنا کتنا ہی خیال کرو تمہارا کوئی فائدہ نہیں۔ ناقدرے ہو ۔ " وہ بے حد چڑچڑا کر بولی گئیں لیکن جب بڈھا نوکر گٹھری باندھ کر سچ مچ چل پڑا تو انہیں ایک دم شدید کمزوری کا احساس ہوا اور گھبراہٹ سے کھانسی اٹھنے لگی۔ کھانستے کھانستے ان کے دل میں نوکر کے لیے رحم کی ایک لہر اٹھی۔ انہوں نے گرم لحاف ایک طرف الٹا اور سویٹر اٹھا کر دروازے کے باہر صحن میں اچھال دیا۔

"بخشو یہ لے جاؤ اپنا سویٹر۔ ایک دفعہ جو دے دیا سو دے دیا ۔ ... " اور پھر وہ کھلے دروازے میں کھڑی رہ گئیں۔ بڈھے

نوکر کے لیے جیسے ان کا دل گھٹنے لگا تھا جی چاہا اسے روک میں منا لیں۔ اب یہ اس عمر میں کہاں محنت کرے گا۔ یہ بے چارہ تو ان کی شادی سے پہلے ان کے میاں کے پاس تھا۔ تنخواہ بھی کیا لیتا بس پان سگریٹ کا خرچ کھانا کپڑا دوا علاج اور سر پر چھت اس کے لیے بہت۔ عجیب سادہ سودا ور حیا گیوں جیسا رویہ تھا اس کا۔ ناراض ہوتا تو کچھ دن کے لیے اپنی گٹھری لے کر چلا جاتا دو چار گھروں میں رہ کر اور وہاں سے بھی روٹھ کر پھر یہیں واپس آ جاتا ہے۔۔۔ بے چارہ، مگر وہ سوچتی رہیں۔ کچھ کہہ نہ سکیں۔ کھانسی ایسی منہ بھر کر آئی کہ وہ غسلخانے کی طرف دوڑیں کھانس کر تھوکا تو بلغم پر خون کی سرخ دھاری گھڑ گھڑا کر جیسے چلتی ریل گاڑی پٹری پر رک گئی کانوں میں انجن سنسنانے لگا۔ انہوں نے ذہن کی کھڑکی سے جھک کر دیکھا وہی سینی ٹوریم والا اسٹیشن

وہ گھبرا کر پلٹیں اور لحاف میں خوفزدہ بچے کی طرح چھپ کر بیٹھ گئیں۔ اور پھر اون سلائیاں نظر آئیں تو کچھ یوں تیزی سے بننے لگیں جیسے اون کے یہ پھندے ان کے آوارہ خیالات کو بھی جکڑ لیں گے۔ ادھر زکام ہے۔ زکام بگڑ گیا ہے شاید۔ ایسے میں گلے سے خون آ جاتا ہے۔ مگر میں اتنی چڑچڑی کیوں ہو گئی ہوں؟ شاید بخار ہے' انہوں نے ایک خوب گہری سانس لی جو ان کے ہونٹوں اور ٹھوڑی پر ہوکے جھونکے کی طرح لگی۔ اون اور سلائیاں تپائی پر ڈال کر وہ اٹھیں اور دیوار الماری کھول کر کچھ ڈھونڈنے لگیں۔۔۔ نہ جانے عورتیں اپنی چیزیں اس قدر بند کر کے کیوں رکھتی ہیں؟ تالے والی الماری اور اس کے اندر بھرے ڈبے۔۔۔ تالے والی چھوٹی چھوٹی صندوقچیاں نانی کے خالی ڈبے بڑے منہ کی بوتلیں۔ کسی میں جہیز کے کپڑوں سے اتارا ہوا پکا گوٹا۔ کسی میں سچے ستارے کی بیلیں کسی میں شیشے کی چوڑیاں کسی میں جھوٹے نگوں کے نقلی زیور اور کہیں گھریلو دواؤں کی شیشیاں۔ مگر وہ یہ چیزیں تو نہیں ڈھونڈ رہی تھیں۔ آخر ایک بڑے سے پھولوں اور تتلیوں کی چھاپ والے ڈبے میں وہ الٹ پلٹ کرنے لگیں۔ اس میں نکاح نامہ تھا۔ میاں کے کچھ خطوط جو انہوں نے ٹریننگ کے لیے دوسرے شہر جا کر بڑی محبت سے لکھے تھے۔ وہ ڈی کے نسخے اور بچوں کے اسکول کی سالانہ رپورٹ کے علاوہ ان کا اپنا میٹرک سرٹیفکیٹ بھی نظر آ گیا مگر وہ چیز نہ ملی جسے وہ اتنی بے تابی سے ڈھونڈ رہی تھیں۔ آخر الماری کے ایک کونے میں بیکار کپڑوں کے ٹین کا وہ ڈبہ مل گیا جس میں ان کی مرحومہ ماں کی یادگار چاندی کی سرمے دانی کے ساتھ تھرمامیٹر بھی رکھا تھا۔ انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے تھرمامیٹر نکالا اور ایک بار جھٹک کر منہ میں رکھ لیا۔۔۔ بند آنکھوں کے سامنے دھڑکتے ہوئے دل پر بھاری بھاری قدم رکھتے گیلن سی جھوٹے وہ سارے دن گزرنے لگے جن میں وہ اپنے میاں اور بچوں سے دور سینی ٹوریم کے جنرل وارڈ میں پڑی تھیں جہاں سارے وقت ان کا ذہن بچوں اور شوہر کے لیے طرح طرح کے وسوسے بنتا رہتا

خدا جانے اب جوتے بھی کیسے بننے لگے ہیں کہ چاپ بھی نہیں سنائی دیتی۔ وہ پشت پر آ کر کھنکھارے تو آنکھوں کے

ساتھ منہ بھی کھل گیا اور تھرمامیٹر زمین پر ٹپک پڑا۔

"میں نے کب زکام ہو دیکھوں بخار تو نہیں کم بخت ٹوٹ گیا شگون ہے" وہ بے فکری دکھا رہی تھیں۔ سوچ رہی تھیں جب انہیں پرواہ ہی نہیں تو کیوں اپنا دکھڑا روؤں۔

"بخشو میاں کو پھر نکالنے کی کوشش ہے وہ تو میں دفتر نہیں گیا تھا جو روک لیا۔" انہوں نے بے تعلق سے کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے کٹیلے لہجے میں کہا۔

"میں نے تو نہیں نکالا۔ کسی کو۔ خود گٹھری باندھ لے... " وہ بھی اسی طرح بولیں جیسے کسی اور سے کہہ رہی ہوں۔ دو دن پہلے کے جھگڑے کے بعد یہی صورت حال تھی۔ اور جھگڑے تو اب بار بار ہی ہوتے۔

"شام کو کچھ لوگ آئیں گے بخشو میاں۔ بازار سے سودے لے لینا اور جن بھر گھر میں تو کوئی ڈھنگ کی چیز بن نہیں سکتی چائے ہی ٹھیک بنا سکو تو بنا لینا۔" انہوں نے باورچی خانے کا دروازہ کھول کر کہا اور پلٹ کر دوسرے کمرے میں جانے لگے۔

"واہ میری بھی تو کوئی عزت ہے۔ اب ان کی خوشامدیں ہوں گی تو اور میرے سر پر ناچیں گے۔ جیسے بخشو میاں ہی تو یہ گھر چلا رہے ہوں۔ اپنی جان کھپا دی اور یہ صلہ ملا ہے مجھے۔ .... " وہ زور زور سے بولتی میاں کے پیچھے آئیں۔ مگر وہ میز پر سے دفتر کی فائلیں اٹھا کر باہر نکل گئے۔ میاں نے باہر اسکوٹر نہیں اسٹارٹ کیا جیسے ان کے ذہن پر بات دھری ہو۔ کہ بات جس سے ان کے دماغ کے سارے کل پرزے چل پڑے۔

"خدا سمجھے!" وہ کرسی پر بیٹھ کر پھسر پھسر رونے لگیں۔

ہمیشہ وہی چاہیں گے جو میں نہ چاہوں۔ ہمیشہ مجھے ذلیل کریں گے دوسروں کے سامنے۔" انہوں نے دوپٹے سے ناک پونچھی اور دل کھول کر رونے لگیں۔ نیم تاریک ٹھنڈے کمرے میں گرم گرم آنسوؤں سے انہیں بڑی طمانیت کا احساس ہوا۔

"یہ دیکھو! یہ جھاڑ پونچھ کی ہے بخشو نے حضور کے کمرے کی۔ " انہوں نے جیسے میاں کو مخاطب کیا اور روتی ہوئی اٹھیں اور میز کی سطح پر جمی ہوئی گرد کی تہہ کو انگلیوں سے صاف کیا اور پھر جھنجھلا کر انہوں نے اپنے دوپٹے کے پلو سے ہی سارا فرنیچر پونچھ ڈالا۔

"تو ذرا دیکھو اگر میں اس وقت دھیان نہ دیتی تو یوں ہی خاک جمی رہتی۔ پھر جو آتا میری صحت کے قصے لے بیٹھتا۔ ہمدردیاں جتاتا.. " غصے میں انہوں نے کمرے کی صفائی کر ڈالی بانس سے چھت کا جالا لے ڈالا۔ مگر روشن دان میں لگے چڑیا کے گھونسلے سے آنکھ بچا گئیں۔ کم بخت چڑیوں نے نہ جانے کب روشن دان کی ذرا سی کھلی درز پا کر تنکے پھنسا لیے اور اب تو

اس میں بچے چوں چوں کر رہے تھے۔ ان کے میاں نے بھی بختو کو ہدایت کر دی تھی کہ اب گھونسلہ نہ چھیڑنا ورنہ بددعا لگے گی چڑیوں
گھونسلے کو نظر انداز کر کے انہوں نے پردے جھٹک جھٹک کر دھول نکالی۔ ابھی چند ہفتے پہلے ہی تو انہوں نے گھر کے خرچ میں سے
پیسہ پیسہ بچا کر یہ اچھے خاصے مہنگے پردے سلوائے تھے۔ اب بچت کوئی سینکڑوں کی تو تھی نہیں۔ یہی انڈوں میں 'گوشت میں' دودھ
میں ڈنڈی مار لیتیں۔ ڈاکٹر نے انہیں انڈا دودھ مکھن روز کھانے کی ہدایت کی تھی۔ مگر وہ چیزیں کھاتی رہتیں اور پردے نہ بنتے تو وہ اور
بیمار ہو جاتیں۔ ڈاکٹر نے یہ بھی تو کہا تھا کہ خوش رہا کرو۔ . . … گھر بنا تو خوش ہوئی اب نئے گھر میں سب پرانی چیزیں تو اچھی نہیں
لگتیں۔ اس لیے ایک پردے ہی کیا یہ میز یہ کرسیاں یہ صوفہ تو انہوں نے ہی خریدا تھا۔ یہ کمرہ تو انہیں اتنا عزیز تھا کہ بچوں کو یہاں گھسنے
نہ دیتیں مگر یہ بڑے میاں بختو ہیں کہ انہیں چیزوں کی اہمیت اور قدر کا پتہ ہی نہیں۔

بڑی دیر تک وہ کھانس کھانس کر کمرے کی صفائی کرتی رہیں۔ کرسیوں کی ترتیب بدل ڈالی دیواروں پر لگی بچوں' میاں اور اپنی
تصویریں گیلے کپڑے سے پونچھیں اور پھر تصویر کے سامنے دیر تک کھڑی رہیں۔ سب جھوٹ تھوڑی ہی کہتے ہیں کہ میں خوبصورت
ہوں۔ انہوں نے مسکرا کر سوچا۔ انہیں اپنی تصویر دیر تک دیکھنے سے بڑی طمانیت اور اعتماد محسوس ہوا۔

جب وہ دوبارہ اپنے کمرے میں آئیں تو انہیں خیال آیا کہ سویٹر تو بنا ہی نہیں۔ بس اب اس کا گلا ہی تو بننا رہ گیا تھا۔ وہ دوبارہ
بننے بیٹھ گئیں۔ جو آئیں گے دیکھیں گے کہ بے چارہ وہیں کیسا پرانا گھسا سویٹر پہنے ہے۔ بے چارہ بچہ! کتنے دن لگ گئے تھے سویٹروں
میں۔۔ وہ تھک گئیں اور ذہن میں پھندے سے گھٹتے گئے۔

"میں شاید بہت چڑچڑی ہو گئی ہوں۔ پرسوں خوامخواہ ہی تو ان کی جلی کٹی باتوں کا جواب اس طرح دینے لگی۔ پتہ نہیں کیوں میں
جب سے بیمار ہوئی ہوں سمجھتی ہوں وہ میرے نہیں رہے۔ ہر بات میں میری کاٹ کرتے ہیں۔ اب آج ہی بختو میاں کا معاملہ دیکھو
میں نے کہا جاتے ہو جاؤ .. . انہوں نے حکم دیا" رکو" ذرا میرا خیال نہیں انہیں..... . "ذلت کے خیال سے آنکھوں میں آنسو آ
گئے۔

"مر جاؤں گی تو چھٹی ہو جائے گی۔ پھر قدر ہو گی میری' میاں جی کو۔ . . "ہاتھ روکر بہتے آنسوؤں کو پلو سے پونچھنے سے پہلے
سرخ سویٹر پر آنسوؤں کے چند قطرے گر گئے۔

"ہائے اللہ توبہ!" انہوں نے سویٹر جلدی سے سینے سے لگا لیا۔ "میں مر جاؤں گی تو میرے دونوں بیٹوں کا کیا ہو گا۔ بھوکے پھریں
گے تو باپ کو خبر نہ ہو گی۔ ننگے پھریں گے تو کسی کو خیال نہ آئے گا۔ وہ جو مثل ہے۔ باپ لکھیا نہیں بعد ماں فقیری بھلی. . توبہ!"

بچوں کے اس انجام کے تصور سے ہی وہ کانپ اٹھیں۔

"دونوں بچے اسکول سے ...نے کا وقت ہو رہا ہے۔ جانے بختو نے کچھ پکایا بھی یا نہیں۔ ارے آج تو وہ پیسے بھی دے کر نہیں گئے۔ غصے میں بھول ہی گئے حضور والا" وہ گھبرا کر اٹھیں۔

یک بار پھر الماری کھلی۔ ڈبے کھلے اور خاصی ریزگاری مل گئی۔ انہوں نے باورچی خانے میں جھانکا۔ ریزگاری بختو میاں کو دے کر جلدی سے انڈے والے کو کہا۔ اور خود انڈے کا سالن بنانے کے لیے پیاز کاٹنے بیٹھ گئیں۔

سر میں دھمک سی ہو رہی تھی اور کھانسی بدستور اٹھ رہی تھی....... کھانا پک گیا۔ بچے اسکول سے آگئے چھوٹے بچے نے کھانا کھا کر خوش خوش نیا سویٹر پہن لیا ۔ بختو میاں بازار سے سودے بھی لے آئے۔

جب شام کو ان کے میاں آئے تو وہ غنودگی میں پسینے سے نہا چکی تھیں۔ نہ جانے کب سو گئی تھیں۔ اور اب باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا جا رہا تھا.... انہوں نے اٹھنا چاہا مگر اٹھا نہیں جا رہا تھا.... انہیں صحن میں میاں کے رشتے کی پھوپی اور ان کی بولیوں سے لنگڑی بیوہ بہن کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اور پھر پڑوس خالہ اور ان کے شوہر کے بولنے کی جانی پہچانی آوازیں آنے لگیں۔

"ہاں تو یہ ہیں ہماری قسمت کے مہمان۔ مجھے معلوم تھا جب لڑیں گے تو منتقلی کے بیچ ہی لوگوں کو بلائیں گے۔ اور وہ ان کے کلرک دوست بھی تو آئیں گے ہاں میں ہاں ملانے......." انہوں نے بہ مشکل گھسیٹ کر اپنے آپ کو اٹھایا کھانستی ہوئی غسلخانے میں گئیں منہ ہاتھ دھویا دوپٹہ بدلا اور بچے کی کھانسی کا شربت گھونٹ بھر پی گئیں... کہ اب یوں ہی کھانسی رہی تو کھانسی کا حساب کتاب کیسے سمجھائیں گی اور پھر اندر ہی اندر کانپتی اٹھتے ہوئے لحاف سے ٹیک لگا کر یوں بیٹھ گئیں جیسے کہیں کی ملکہ ہوں اور اب مہمان انہیں سلام کرنے حاضر ہوں گے۔ مگر غصے اور بے بسی کی احساس سے ان کا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر نکل پڑے گا۔

"میں کیوں جھگڑی ان سے۔ وہ تو بس میرے کنیز و ریم سے آنے کے بعد سے پتھر بن گئے ہیں۔ کچھ کہوں سنتے ہی نہیں۔ پھر میں ستانے کو کیوں مری جاتی ہوں۔ جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔ کہیں وہ ان سب کے سامنے یہ نہ کہہ دیں کہ میں رات کو ان سے جھگڑ کر ان کے کمرے کے فرش پر پڑی روتی رہی تھی کہ شاید منائیں گے..... مجھے ان کے کمرے میں جانے کی کیا ضرورت تھی۔ نہیں بولتے نہیں پوچھتے نہ سہی اللہ نے دو بیٹے دیئے ہیں۔ یہ سلامت رہیں گے۔ بچے کیا ماں کی باتیں حرکتیں نہیں سمجھتے؟ بڑے ہو کر خود فیصلہ کریں گے میرا ان کا۔ نہ بولیں نہ پوچھیں "

دوسرے کمرے میں ان کے میاں بول رہے تھے۔

"دیکھ لیجئے! اعراج' صبح دے بتادیا تھا کہ آپ لوگ آئیں گے۔ مجھ سے ناراض تو دنیا سے ناراض"

اپنے میاں کا فقرہ پورا ہونے سے پہلے وہ کمرے میں حاضر ہو گئیں۔ وہی چھلکتی سی نیم وا آنکھیں بخار سے تمتمایا ہوا رنگ۔ سموسوں کی پلیٹ ان کے ہاتھ میں تھی۔

"آؤ بٹھو بیٹی۔ بخشو میاں سے آئیں گے چائے والے.... "پھوپی دیوان پر ایک طرف کھسک گئیں۔

"بخشو میاں؟ ارے پھوپی شکر کیجئے وہ تو میں گھر میں موجود تھی ورنہ یہ تو اسے بھی دکھ دے چکی تھیں۔ میاں نے بڑے خوش سے سموسوں کو علاج دی اور داد طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔

اور وہ بمشکل خود کو چیخ کر رونے سے روک سکیں۔

"آپ کو تو معلوم ہے پھوپی۔ بخشو میاں کی عادتیں۔ جب چاہیں رہیں جب چاہیں گٹھری باندھ کر نکل جائیں .. "وہ آہستہ سے بولیں۔

"ہاں یہ بات تو ہے۔ خدا لگتی کہوں گی ایک دفعہ تمہارے ہاں سے روٹھ کر میرے گھر میں بھی تو ڈیرہ ڈالا تھا۔ دو ہفتے نہیں رہے کہ خود ہی روٹھ کر کہیں اور چلے گئے۔ بس بے چارے بخشو بوڑھے ہو گئے بہت۔ اور پھر بنیا پن نوکروں کا..... "

پھوپی بخشو میاں کے قصے میں الجھ گئیں ادھر خود بخشو میاں اپنے بچے کھچے دانت نکالے چائے کی کشتی اندر رکھے آ گئے۔

چائے پیالیوں میں ڈالتے ہوئے وہ سوچ رہی تھیں "کتنے دن سے چائے کی ٹرالی لینے کو جی چاہتا ہے مگر ریزگاری اتنی جمع ہونے پاتی۔ جب دیکھو جب مہنگائی کا رونا روتے رہتے ہیں اور گھر کا روزانہ خرچ دینا بھول جاتے ہیں۔"

سب مہمان چائے پینے اور سموسے چکھنے لگے۔ کمرے میں پیالیوں اور چمچوں کی آواز گونج گئی۔ اچانک کمرے میں ایک چڑیا روشن دان کے شیشے سے ٹکرائی۔ انہوں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا جالے اتارتے ہوئے روشن دان کی درز شاید بالکل بند ہو گئی تھی اور چڑیا جو اندر آ گئی تھی باہر نہیں نکل پا رہی تھی۔

"پوچھئے .... آج پھر پوچھئے ان سے.... "میاں نے پھوپی کو بیچ میں پڑنے کی کوشش کی۔

"دوسروں سے پوچھتے ہیں۔ کبھی آپ نے بھی پوچھا ہوتا .. "وہ نہیں بولنا چاہتی تھیں پر بول پڑیں۔

"اے لو بی بی ہم دوسرے ہو گئے ہم تو اپنا سمجھ کر آ جاتے ہیں۔" رشتے کی پھوپی برا مان کر منہ بسورنے لگیں۔

"ارے نہیں پھوپی میں ایسی بات نہیں کہہ رہی۔ میں تو ان سے کہہ رہی ہوں آپ کے بھتیجے سے "انہوں نے پچکار کر

پرانی گرم چادر اپنے گرد زور سے لپیٹ لی اور جیسے چادر کے خدا جانے کیا کیا چھپا رہی ہوں۔

''تمہیں کیا کمی ہے پوچھو' تمہارے پاس کیا نہیں؟'' تمہیں کیا سڑک پر بٹھا رکھا ہے؟ شکر نہیں کرتیں کہ مکان میں بیٹھی ہو۔ تمہیں کھانے کو نہیں ملتا؟ پہننے کو کپڑا نہیں؟ دوا علاج نہیں ہوتا؟ اور کیا پوچھوں بتاؤ نا؟ میاں کی آواز بلند ہونے لگی۔

''ہاں ہاں بیٹی جو کہنا ہے کہو'' پڑوسن خالہ کے شوہر نے رسان سے کہا'' گھر کے طعنے رات دن سنتی ہوں جیسے گھر انہوں نے بنوایا ہو کھڑے ہو کر۔ ارے میں نہ ہوتی تو یہ گھر بنتا؟ اپنا پیٹ کاٹ کاٹ اپنا تن مارا۔ پیسہ پیسہ دانتوں سے پکڑا جب یہ گھر بنا ہے۔ میں نے تو اپنے پراویڈنٹ فنڈ کا پیسہ بھی اسی میں ڈالا۔ چھ تولے سونے کا سیٹ تھا میرے جہیز کا وہ بھی بیچ کر اسی میں لگا دیا۔ وہ بولتی چلی گئیں۔

''سن لیا آپ لوگوں نے؟ ایسی چھچھوری طبیعت ہے ان کی۔ آج کھلیں سب کے سامنے۔ ہم نے انہیں کھلایا پہنایا دوا علاج کے بیسیوں رات دن کی بیمار آج یہ زیور اور روپے کا طعنہ دے رہی ہیں۔ کیا میں نے تم سے روپیہ مانگا تھا؟ قسم کھا کر کہو بچوں کے سر کی .... '' میاں آگ بگولہ ہو گئے۔

''ہر بات کا غلط مطلب لگاتے ہیں۔ میں تو کہہ رہی تھی میں نے اس گھر کے لیے۔ آپ کے لیے بھی قربان کر دیا اور آپ ہیں کہ میری ذرا پروا نہیں۔ میں نے آپ کے کہنے پر اپنی دس سال کی اسکول ٹیچری بھی چھوڑ دی شادی کے بعد .... '' وہ بھی بولتی گئیں۔

''ارے بی بی نیک بخت عورتیں اپنے گھر کے لیے ایسا ہی کرتی ہیں۔'' بوڑھے کلرک نے کہنا شروع کیا'' میری بیٹی نے تو .... ''

کلرک کی بیٹی کی قربانیوں کی فہرست لمبی تھی۔ جسے وہ اپنے کھولاؤ میں نہیں سن رہی تھیں۔ وہ تو کمرے میں موجود چڑیا کی طرح ہراساں تھیں جواب باہر کی روشنی پا کر بار بار سب کے سروں پر اڑ رہی تھی۔

''ہاں سچ تو ہے اس میں گنانے کی کیا بات ہے یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ اب تو خیر سے مرد اتنے شوقین بھی نہیں رہے۔ بہت ہوا تو سینما دیکھ آئے دوستوں کے ساتھ ہوٹلوں میں چائے پی لی۔ ہمارے میاں نے تو لاکھوں کا گھر خاک کر دیا تھا۔ ہمارا ڈھیروں زیور گانے بجانے والیوں کو پہنا دیا۔ اس پر بھی بھی کچھ کہا کہ اپنے باوا کے گھر سے اور لاؤ۔ اللہ جنت نصیب کرے ان میں کون سی ست نہیں تھی؟ ہاہا آ . اور یہ تمہارا میاں بے چارہ گھر سے دفتر دفتر سے گھر . ارے شکر کیوں کرو۔ ایسا بھولا بھالا میاں ملا ہے۔ ایک ہماری اس بیٹی نے بھگتا تھا۔'' انہوں نے اپنی پولیو زدہ بیٹی کو دیکھ کر لمبی آہ بھری۔

''گھر میں بھی آئیں گے تو جیسے دفتر میں بیٹھے ہیں۔ کبھی گھر کا حال پوچھا دو برسوں میں۔ جب سے میں بیمار ہوئی تو........'' ان کی آواز بھرا گئی

''ہاں! ہاں! اور خوب ٹسل مچاؤ۔ آنسو تو تمہاری پلکوں پر دھرے رہتے ہیں۔

جب گھر میں آؤ منہ سوجا ہوا دیکھو۔'' وہ ترخ کر بولے اور بولتے چلے گئے۔

''کبھی تم نے پوچھا کہ میرا کیا حال ہے؟ میری کیا پریشانیاں ہیں۔ دفتر کے کیا حالات ہیں۔ مکان کا قرض سر پر چڑھا ہوا ہے۔ صاحب! یہ تو چاہتی ہیں کہ گھر میں بیٹھا ان کا منہ دیکھتا رہوں ان کے قصیدے پڑھتا رہوں......'' وہ بولتے گئے...... تو وہ ایک دم چیخ اٹھیں۔

''دیکھئے حد ہوتی ہے۔ بس کیجئے۔ یہ قصیدے پڑھیں گے میرے؟'' انہوں نے آنسو ضبط کئے۔

''دیکھا آپ لوگوں نے؟ دیکھا۔ سیدھی بات ہے یہ مجھ سے بیزار ہو گئی ہیں۔ میں ٹکٹ لے آیا ہوں ریل کا۔ یہ دو ایک مہینے اپنی بہن کے پاس رہ آئیں۔ کراچی میں سردی بھی نہیں...... بچوں کو پھوپھی آپ سنبھال لیجئے گا......'' میاں نے قصہ تمام کیا اور ایک سموسہ اٹھا کر دانتوں سے کترنے لگے۔

''میں کیوں جاؤں کسی کے گھر اپنا گھر چھوڑ کر؟ اپنے بچے چھوڑ کر؟ اور پھر چھوٹی بہن کی سسرال میں؟ یہ بھی خوب رہی۔ میرا بھائی ہوتا تو شاید جانے کا ٹھکانہ ہوتا ہے......'' وہ ایک دم پھپھک کر رو پڑیں۔

''اے ٹھیک تو کہہ رہی ہے یہ۔ بھائی باپ کے گھر جانا تو ٹھیک ہوتا ہے مگر بہن کی سسرال میں تو''...... پڑوسن خالہ بول پڑیں۔

''بہن آ کر نہیں رہی تھیں ایک مہینے۔ اے اب ایسا بھی کیا؟'' پھوپی بولیں اور بولتی چلی گئیں ''بھئی آج کل کی عورتیں بھی خوب ہیں۔ اے ہم تو جب بیزار ہوتے تھے تمہارے پھوپھا سے۔ تو بہن بھائی خالہ ممانی چچی جس کے گھر جی چاہا اپنے بچے سمیت کر مہمان ہو جاتے۔ پھر کچھ دیر بعد خود ہی منانے آتے اللہ بخشے۔ ہماری اماں کہتی تھیں اس طرح بیوی کی قدر ہو جاتی ہے میاں کو......''

''یہ مجھ سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کے لیے کیا نہیں کیا۔ ہانڈی سے اچھی بوٹیاں الگ دیں' گھی کا تار ان کے برتن میں ڈالا۔ ان کے کپڑے دھوئے استری کی' جوتے پالش کیے۔ ارے ہم نے تو کبھی کوئی جمعدارنی بھی صفائی کے لیے نہیں رکھی۔ میں نے گھر کے خرچ میں سے پیسہ پیسہ جوڑا اور اس گھر پر خرچ کیا۔ کیا کچھ نہیں کیا؟ بچے پالے کبھی بچوں کی بیماری آزاری میں نہیں کہا کہ

دفتر سے چھٹی لو اور اب کہہ رہے ہیں کہ میں چاہتی ہوں یہ گھر بیٹھ کر میری صورت تکیں ارے کبھی تو پوچھیں کہ مرتی ہو یا جیتی ہو؟

"ارے بیٹی اللہ نے عورت کو اتنی ہمت دی ہے کہ سب کرتی ہے۔ اس کا کیا ذکر کرنا........ "میری بیٹی نے تو........ "بوڑھے کلرک نے پھر اپنی بیٹی کا ذکر چھیڑا مگر کسی نے ادھر توجہ نہ دی۔

"تمہارا کیا حال پوچھیں سدا کی بیمار؟" میاں منہ لٹکا کر بولے۔

"میں سدا کی بیمار تھی؟ اللہ حد ہے جھوٹ کی بھی۔ میں تو تمہارے گھر آ کر بیمار ہوئی...... بس کیا کیا کہوں ڈاکٹر نے نہیں کہا تھا کہ ناقص غذا اور غم والم سے یہ بیماری ہوتی ہے...... "وہ تڑپ کر زور زور سے رونے لگیں۔

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ سردی کا غروب ہوتا ہوا سورج بھی ایک بادل کے ٹکڑے کے پیچھے چھپ گیا اور کمرے میں اندھیرا بڑھ گیا۔ چڑیا اب کمرے میں بے تابی سے اڑی اور پھر روشندان کے شیشے سے ٹکرا گئی۔

"تم کتنا کتنا بیمار ہوئے میں نے کبھی کسی سے نہیں کہا۔ کسی سے فریاد نہیں کی ڈاکٹر کہتا تھا کہ تمہاری خاندانی بیماری تم میں اور بچوں میں...... وہ بین کر رہی تھیں کہ میاں کھڑے ہو گئے۔

"خبردار جو خاندان کی بات کی زبان کھینچ لوں گا........"

"دیکھ لیجیے اب خود جو چاہیں کہیں سب کے سامنے...... "وہ زور زور سے رونے لگی۔

"اے بھائی! شریف عورتوں کی آواز گھر سے باہر نہیں جانا چاہیے۔" بوڑھے وہ تند نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا مگر وہ اس وقت اپنے آپ میں نہ تھیں انہوں نے وہ ہاتھ جھٹک دیا۔

"اچھی شرافت ہے یہ ساری دنیا کو سنائیں اور میں نہ بولوں۔ سن لیجیے یہ مجھے بوجھ سمجھتے ہیں۔ ان کا جی بھر گیا ہے مجھ سے۔ میری ہر بات انہیں بری لگتی ہے اور میں نے ان کے لیے کیا نہیں کیا...... وہ اسی طرح روتے ہوئے بین کرتی رہیں۔

"چپ رہو........! میں کہتا ہوں چپ رہو۔ تم جاؤ اپنی بہن کے پاس۔ جاؤ سامان باندھو۔ جب تک میں نہ بلاؤں مجھے آ کر صورت نہ دکھانا۔ وہ نہیں آ کر رہی تھی تمہارے پاس؟" وہ شیر کی طرح دھاڑے۔

"وہ دن میری بہن آ کر رہی تھی بے چاری کو ساس نے مارا تھا۔ نہ آتی تو کیا کرتی...... اب یہ احسان جتا رہے ہیں۔ آخر یہ میرا گھر بھی تو ہے۔ میں نے اس میں اپنا پراویڈنٹ فنڈ ڈالا اپنا زیور ڈالا میں نے کوڑی کوڑی بچائی میں نہیں جاؤں گی اپنے گھر سے۔" وہ چیخیں بالکل دیوانوں کی طرح۔

"آپ لوگ نہیں سمجھا سکتے اس عورت کو۔ یہ کسی کی سننے والی نہیں۔" میاں نے بے بسی سے سب کو مخاطب کیا۔

"تم دوسرے کمرے میں چلی جاؤ........ اچھا میرے ساتھ آؤ۔" پڑوسن خالہ کا جی بھر آیا۔

"مگر خالہ میں کیوں جاؤں میرا کیا قصور ہے۔ ان کا دل کہیں اور لگا ہے یہ مجھے نہیں پوچھتے پھر کسے پوچھتے ہیں؟ میں سب سمجھتی ہوں........" وہ مچل مچل کر روتی اور کہتی رہی۔

"بھابھی........ اب بھیا ٹکٹ لائے ہیں تو دو چار دن کو کراچی........" پولیو زدہ نند نے سمجھانا چاہا۔

"میں نہیں جاؤں گی اپنی ہنسی اڑوانے۔ میں اپنے بچوں کو نہیں چھوڑ کر جا سکتی"

اس وقت گیند باہر سے آ کر دروازے پر زور سے لگی۔

"ہاں تو دو دروازے دیکھیں گے تمہارے ابا اور بھوائیں گے میری آنکھوں کے سامنے یہ حال ہے گھر کا۔" وہ جیسے ہسٹریا میں بک رہی تھی۔

"میں کہتا ہوں سامان باندھو ٹکٹ ضائع جائے گا جلدی........" وہ اب کے دھیمی آواز اور مستحکم لہجے میں بولے۔

"نہیں جاؤں گی جانا ہے تو آپ بھی چلئے۔ بچے بھی چلیں۔" وہ اسی ہسٹریائی انداز سے کہے گئی اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور آنسو تھے کہ منہ دھو رہے تھے۔

اچھا........ تو پھر........ "میاں کی کیفیت بالکل آتش بازی کے انار جیسی ہو گئی جس کو دیا سلائی دکھا دی گئی ہو۔" تو پھر .... تو پھر میں تم کو طلاق دیتا ہوں........ طلاق........"

اور جیسے اس انار کے سارے جلتے پھول ان پر برس گئے۔ پھر بھی نہ جانے کیسے ان کا کانپتا ہوا ہاتھ بے اختیار آگے بڑھا۔ درمیانی گول میز جیسے انہیں نظر نہیں آ رہی تھی وہ میز پر اوندھ گئیں اور جانے کیسے انہوں نے میاں کی پتلون کا پائنچہ مضبوطی سے مٹھی میں جکڑ لیا اور کچھ کہنے کی کوشش میں ہانپنے لگیں........ آنکھوں اور ناک سے بہتا پانی کھلے ہونٹ اور اجڑے بالوں میں چمکتے سفید بال وہ اس عالم میں کیسی بدصورت لگ رہی تھیں۔ سب نے نظریں جھکا لیں........ میاں منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔

پڑوسن خالہ نے اپنے آنسو خشک کئے بغیر۔ بڑا زور لگا کر انہیں میز پر سے اٹھایا اور ٹکے کے کام والی بوسیدہ گرم چادر ان کے سر پر ڈال دی۔

"جو ہونا تھا وہ ہو گیا........ اب ان سے تمہارا پردہ واجب ہے........" پڑوسن خالہ کے شوہر نے بمشکل کھنکھار کر بھاری آواز

میں کہا اور سر جھکایا تو ان کی گہری سانس سے اللہ نکلا.......

انہیں رشتے کی پھوپی نے بٹھا دیا کہ گر نہ پڑیں....... مگر وہ اپنی کلائی میں پڑی سونے کی تار جیسی دو چوڑیاں کھسوٹ کر اتارنے لگیں۔

"کیا یہ چوڑیاں آپ کے گھر کی ہیں جو اتار رہی ہیں۔" بوڑھے کلرک نے میاں سے سوال کیا۔

"جی انکو جو دے دیا سو دے دیا۔ ان سے کہئے چوڑیاں پہنے رہیں۔" میاں نے مدھم آواز میں کہا۔

لیکن وہ تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہی تھیں۔ چوڑیاں اتار کر میز پر ڈال دیں اور پھر کانپتے ہاتھوں سے کانوں میں پڑی چھوٹی چھوٹی بالیاں بھی اتار کر چوڑیوں کے بیچ میں رکھ دیں۔ مگر یہ بالیاں تو ان کے جہیز کی تھیں۔ پھر وہ کانپتی ہوئی کھڑی ہوئیں اور سر پر سے گوٹے کے کام والی چادر بھی اتار کر میز پر ڈال دی....... اور خاموشی سے دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

"ہے ہے بے چاری کا لڑکوں پر بھلا کیا حق....... ارے کوئی بیٹی ہی پیدا ہوئی ہوتی تو یوں اکیلی نہ نکلتی گھر سے....... ہائے.......!" پڑوسن خالہ نے سوچا اور اپنی آنکھیں اور ناک پونچھتی دوسرے کمرے میں ان کے پاس چلی گئیں۔

اب کمرے میں خاموشی اور سردیوں کی شام کا اندھیرا اتر رہا تھا....... میاں نے ہاتھ بڑھا کر بجلی کا بلب روشن کیا تو چڑیا پھر ہر طرف اڑنے اور روشن دان کے شیشے سے ٹکرانے لگی....... میاں نے چڑیا کو دیکھا اور پھر باہر کھلنے والا دروازہ کھول دیا کہ چڑیاں گھونسلے تک پہنچنے کا راستہ خود تلاش کر لیتی ہیں۔

◆◆◆